حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ درّانی

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

جس نے صالح عمل کیا مردوں میں سے یا عورتوں میں سے اور وہ مومن ہے ہم اس کو حیاتِ طیبہ سے زندگی دیں گے اور ان کے اعمال کی احسن جزا دیں گے

حیاتِ قادر

مولف

عبید اللہ درّانی

بار اول:۔ ۱۹۵۸ء تعداد:۔ ۲۵۰۰

بار دوئم:۔ ۱۹۶۴ء تعداد:۔ ۲۵۰۰

ناشر:۔ فیض قادر پشاور

کتابت:۔ ایم۔ اے۔ ای صوفی

مطبوعہ:۔ پبلک آرٹ پریس۔ پشاور

بار سوم ۱۹۸۰ء تعداد ۱۰۰۰

ناشر قائم حسین

مطبوعہ حبیب پرنٹنگ پریس
ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

ملنے کا پتہ

(۱) قادر نگر۔ بنیر سوات

(۲) محی الدین پاشا۔ D.49 پشاور یونیورسٹی پشاور

(۳) خواجہ محی الدین پاشا۔ C.250۔ بلاک۔ 6۔ پی ای
سی ایچ ایس۔ کراچی

(۴) غلام رسول قریشی اخوند ہاؤس خیرپور (میرس)

(۵) سید عرفان احمد II۔ B۔ 44۔ گلبرگ 3۔ لاہور

(۶) میجر نیازی۔ ہاؤس نمبر ۵۶ اسٹریٹ ۲۵
6/4 اسلام آباد

بھارت میں کتاب ملنے کا پتہ:۔
مدار خان فوٹو آرٹسٹ۔ قادر نگر۔ دھاگرم
(جنوبی ہندوستان)

انتساب

اِس مختصر سی پیشکش کو موجودہ زمانہ
کے تعلیم یافتہ حضرات کی خدمت میں
پیش کرتا ہوں جن کا دل خود اس سوال کا
جواب چاہتا ہے کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں۔
یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
(اللہ دیتا ہے ہدایت اپنے نور سے جسکو چاہے)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

سہرا

ہدیہ تہنیت بہ تقریب جشن سالگرہ مبارک حضرت بابا قادر اولیاءؒ

بتاریخ ۳ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ بمقام قادر نگر دریانگرم (جنوبی ہند)

دُولہا بنے ہیں عرشِ بریں پر حسنی حسینیؓ رنگ میں قادر
لائے فرشتے جوڑا بہشتی حُوروں نے گوندھی زلفِ معنبر
ہار پہنائے خُلد میں سب نے تاج بھی لائے تاجِ پیمبر
سہرا سجا لولاکَ لَمَا کا باندھا حق نے حق کے سر پر
پھولوں پہ نکھری سورہ یٰسین پھیلی ہر اک سو بوئے معطر
وجد میں آیا عالم سارا آگئے ہادی خلق کے رہبر
کملی سے نکلے شاہِ مدثر رحمتِ عالم، شافعِ محشر
جام اٹھائے قالو بلیٰ کا آئے دولھا ساقیٔ کوثر
رازِ ازل کا خلق میں پہنچا پردہ حلم رُخ سے ہٹا کر
خود ہی محمدؐ، خود ہی قادر اِلَّا اللّٰہ، اللّٰہ اکبر
جُھک گئی خلقت ساتھ ولی کے دیکھی سب نے شانِ قلندر

پیش کردہ
ولی الدین



بابا قادر اولیاء

فہرست

پیش لفظ

حیاتِ قادر کی مقبولیت اور افادہ کے پیشِ نظر کتاب کا تیسرا ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔ اس ایڈیشن میں ایک باب آخری دور کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ حضور بابا قادر اولیاءؒ کی حیاتِ ظاہری کے آخری ایّام کی جھلک چشمِ باطن کو مل سکے۔ اس ایڈیشن میں ظہور سے لے کر وصال تک کے حالات کے ذریعہ مقصدِ فطرت کی آئینہ داری کُھلی طور پر ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امرِ الٰہی کے تحت کس طرح مادّی جسم میں رہ کر بھی ارواحِ مقدّسہ ارتقائے باطن کی منازل طے کر سکتی ہیں۔

ایسی ہستیوں کی حیاتِ باطن کا حال لکھنے کی طاقت کسے نصیب ہو سکتی ہے صرف اس فانی جسم کے ۶۳ سال کے حالات پڑھنے کے بعد چشمِ بینا کو یہ صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ فنا ہونے والی چیز تو فنا ہوتی ہی رہتی ہے مگر جوہرِ اعلیٰ کو بقائے دوام ہے یہ علم و عقل کی رسائی سے باہر کی بات ہے۔ اسے صاحبِ حال ہی کچھ سمجھ سکتا ہے۔ ایک عاشق کا قلب یار کی بارگاہِ ناز ہوتا ہے اور ایک عاشق ہی وصل کی لذّت سے

دوچار ہو کر یہ ایمان مستحکم رکھ سکتا ہے کہ جوہر اعلیٰ کو بقائے دوام ہے۔ کل من علیھا فانٍ ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

یہ بقا ازل سے تھی اور ابد تک رہے گی اس بقا' اس یبقی وجہ' کا رنگ ایسی ہستیوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ھو اللہ احد۔ مٹی کے تپلے تک دیکھنے والی آنکھیں تو کل من علیھا فانٍ سے آگے کیا دیکھ سکتی ہیں۔ نورِ حق پیدائش اور موت کے چکروں سے آزاد ہے۔ اسی لئے تاکیداً فرمایا ہے لم یلد و لم یولد بغیر کل من علیھا فان کے وجہ' ربک کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ اس فنائے مطلق کے بعد ہی اصل بقا ہے۔

حیاتِ قادر پڑھ کر اگر انسانیت کو حیاتِ جاوید کا یقین ہو جائے اور راستہ ڈھونڈنے والوں کو یبقی وجہ ربک کا دامن ہاتھ آجائے تو ان کے نظر و عمل میں ایسی تبدیلی آسکے گی جو انہیں مادی حیات سے ماوراء کی طرف رجوع کر دے۔ اور انسان کو اپنا اصل مقام حاصل ہو جائے۔

عبیداللہ درانی

۹ شعبان ۱۳۸۳ھ قادر نگر

(نزد پیر بابا۔ بنیر۔ سوات)

تمہید

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق   تابگویم شرح دردِ اشتیاق

ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسے نامعلوم غیر فانی لمحات آتے ہیں جب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی لامحدود نغمۂ کائنات کا ایک سُر ہے اس وقت جزو کل کے امتیازات اٹھ جاتے ہیں۔ قیودِ زمان و مکان سے بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ ایک ایسی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہے جس کے تحت نظامِ کائنات اور اس کے ہمہ گیر حسن کو اپنا دل سمجھنے لگتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی چند لمحے بعد میں اور خاص کر عالمِ ضعیفی میں ایک گرانقدر پونجی کی طرح باقی رہ جاتے ہیں اور جب بھی کشاکشِ زندگی سے کچھ لمحے سکون و قرار کے نصیب ہوتے ہیں تو ان گرانقدر لمحات کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تقویت بھی پہنچاتی ہے۔ ایسے لمحات قدرت کی طرف سے ہر فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور چاہے کسی مذہب کا ہو کم سے کم ایک بار ضرور نصیب ہوتے ہیں۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جن کی لذیذ کیفیت دنیا کی تمام لذتوں سے لطیف تر اور جن کا اثر ہر قسم کے اثر سے دیر پا ہوتا ہے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ایک ایسی ہستی کی زندگی کی جھلکیاں دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے جس کی زندگی کا ہر لمحہ لطیف اور روشن ہے جس کی زندگی بچپن سے آخر وقت تک ایک ہی سلسلہ کی کڑی بنی رہی ہے۔ ایسی ہی ہستیاں تسلسلِ حیات کے اسرار اور مشیتِ ایزدی کے رموز کا مرکز بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی ہستیاں حقانیت اور مقصدِ حیات کے غیر فانی پیغامات کی علمبردار بن کر حق کا بول بالا کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک گلاب اپنا حسن اور روح نواز خوشبو نشر کرتا ہے۔

ایسی ہستیوں کو اگر ہم سمجھنے کی کوشش کریں تو کائنات کے بہت سے راز خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔ گناہ کیا ہے اور ثواب کسے کہتے ہیں؟ اگر تقدیر اٹل ہے تو تدبیر کی گنجائش کیسی؟ اگر مرضیٔ مولیٰ کے بغیر کوئی شے حرکت نہیں کرتی تو اعمال کی پرسش کیسی؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
(غالب)

باطن اور ظاہر کا تضاد حیات و موت کا راز۔ غم و مسرت کا مقام۔ جن و انس کی تخلیق۔ غرض ہزاروں ایسے مسائل ہیں جن کو

آج تک۔ کوئی فلسفی حل نہ کر سکا۔ مگر ان بزرگوں کی توجّہ کا ایک ہلکا اثر بھی حقیقت سے دوچار کر دیتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا متحمل صرف دل ہوتا ہے۔

اسی توجہ سے قوموں کے عروج و زوال۔ کے راز۔ شہروں اور ملکوں کے فروغ و تباہی کے بھید اور پستی کے اسباب سمجھ میں آجاتے ہیں۔

اسی توجہ سے آنِ واحد میں تمام سوالوں کا یہ بنیادی سوال بھی واضح اور روشن ہو جاتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ کیوں پیدا ہوا ہوں۔ مجھے کیا کرنا ہے اور اس سب کا انجام کیا ہے۔

اکثر بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ ان میں کرامتیں۔ ان کے ارشادات اور روزمرّہ کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ مگر آج تک کوئی یہ نہ لکھ سکا کہ غارِ حرا میں کیا ہوتا تھا۔ اور جب نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم رب زدنی علمًا وفهما کی دعا فرماتے تھے تو آپ کی پُر نور آنکھوں سے آنسو کیوں بہنے لگتے تھے!! ظاہری کرشمہ و کرامات کو تو یہ ظاہر کی آنکھ بھی دیکھ لیتی ہے اور حسنِ اخلاق و خلوص کا اثر بھی دلوں پر ہوتا ہے۔ لیکن ان بزرگوں کے دل کا وہ کیا راز ہے جس کی وجہ سے ان

کاظہور ہوتا ہے۔ باطنی دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اور ان کے دلوں پر کیا کچھ گزرتی ہے۔ اس بھید کو کون بتاتے !!! ظاہر سے باطن تک پہنچنا سائنس کا زاویۂ عمل ہے۔ لیکن اس کا طول امل معلوم برخلاف اس کے اگر باطن کے نکتہ کو پکڑ لیں تو اس کے توسل سے ظاہر کی تمام باتیں خود ہی روشن ہو جاتی ہیں۔

اِس کتاب کے لکھنے میں نہ تو میں ایک سائنسداں نقاد کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتا ہوں جو جز کی تفتیش کے لئے کُل کو تباہ کر دیتا ہے اور نہ ہی ایک عقیدتمند کی طرح واقعات کو محبت کے رنگ میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ایک سادہ طالب علم کی طرح جو آنکھوں نے دیکھا اور دل نے پایا ہے پیش کرتا ہوں۔ بالکل اس مصوّر کی طرح جو اجزا کی مناسب ترتیب سے تصویر کو مکمل بناتا ہے جس طرح ایک شاہکار کی نمایاں حقیقت توحید ہوتی ہے۔ اسی طرح میں بھی حضور قبلہ بابا قادر اولیاؒ کی زندگی کی تصویر کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے صرف ان کی یکتائی کو پیش کرتا ہوں۔

میں خوش نصیب ہوں کہ میرا پیر و مجذوب نہیں ہے جس کے جلوؤں سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ اور شعور و فہم باطل

ہو جاتے ہیں - بلکہ وہ ایک کامل و مکمل سالک ہے جو ایک بچّہ کی طرح سادہ اور بھولا ہے - اس کی سادگی ایسی ہے جو قرآن شریف کی آیتوں میں اور رسول کریمؐ کی زندگی میں پائی جاتی ہے اور جو کامل و اکمل بن جانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے - یہی سادگی جہاں ایک ظاہر بیں کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے وہیں ایک جویائے حق کے لئے مشعلِ راہ بھی بنتی ہے -

کسی چیز کی ماہیت سمجھنے کے لئے یک رنگی اور ہم آہنگی میسّر نہ آسکے تو اتنا تو کم از کم ضروری ہے کہ اس چیز سے حسنِ ظن رکھا جائے - آگ کو آگ ہی سمجھ سکتی ہے اور پانی کو پانی - جب تک فہم اور قلب اس عالم یا مقام پر نہ پہنچے جس عالم میں مقصود کا اصلی وجود ہے اس وقت تک صحیح طریقہ سے بات نہیں بنتی - طالب کے مزاج میں اگر سادگی ہو اور اس کے پچھلے تصوّرات دخل اندازی نہ کریں اور وہ خلوص و محبّت سے کسی ہستی کی طرف بڑھے تو وہ ہستی خود محبت کے جوش میں اس سے بغلگیر ہو جاتی ہے اور اس میں سما جاتی ہے -

فہم و ادراک کے سہارے زیارت کرنے والے اصحاب سے میری گذارش ہے کہ جذبۂ خلوص و محبّت سے اس کتاب کو

ہاتھ میں لیں۔ پڑھیں۔ غور کریں۔ اور دل میں بسائیں اور فیضانِ حق شاملِ حال ہو تو عالمِ اسباب میں یا عالمِ ارواح میں بابا قادر اولیا تک پہنچنے کی کوشش کریں کیونکہ ارشادِ نبوی من رأنی فقد رءا الحق میں بڑے اسرار ہیں۔ پہنچے ہوئے تک پہنچنا بھی ایک عبادت ہے۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال
(تری صورت ہر سوال کا جواب ہے)
(رومی)

قادر دوارے جو بھی آئے
اپنے من کی اِچّھا پائے
ان کے درشن بہتی گنگا
سوکھے دھانوں پانی لائے

روپ انوپ کھلی پھلواڑی
کوئل بن ہردے چہکائے
چتون سکھ شانتی کا ساگر
موج اٹھے اور پار لگائے

باتیں جیسے مست پون ہو
آشاؤں کے پھول کھلائے
نین بجا دیں پریم کی بینا
جو سُن پائے سُر ہو جائے

کہت ہے داسی سُن بھئی سادھو
قادر جپ کر ما پلٹائے

(رحمن بابا)

توئی حرفِ کن مظہرِ لا الٰہ　　سرِ معرفت دستِ خیر الوریٰ
فروزاں چراغ بہ طاقِ دلم　　چناں ضو فشانی کہ نورِ خدا

چراغ لا الٰہ اندر دلِ تاریک افروزم
ہمہ جا نورِ الا اللہ را جلوہ فشاں بینم

(رحمٰن بابا)

دلم مست شد در ہوائے محمدؐ
چو آید نسیمے ز کوئے محمدؐ
سلامے کنم یا کہ بوسم قدم را
بہ ہر طرز باشم فدائے محمدؐ
نوید آمدہ در دیارِ غریباں
کہ تا خلق گیرد ردائے محمدؐ
ولی کن فیکون بہ کار جہاں است
کہ دارد ہنوز آرزوئے محمدؐ

(ولی الدین)

چو زلفِ عنبریں را در گرفتم
ز بندِ دو جہاں آزاد گشتم

جمالِ روئے تو ماہ تمامے
دریں عالم سراپا نور بینم

چہ مستی و سرور و جذب دادی
جہانِ ھاؤ ھُو را وجد آرم

مپرس از من متاعِ شوق و مستی
جمالِ دوست در عکس جمالم

چہ پُرسی چہ کنم گر حق بہ بینم
بہ ہر طرزے کہ بینم غیر باشم

نہ باشم ذات حق را کے بہ بینم
خدارا خود بگو من شرم سارم

چرا بخشی خدائی ایں ولی را
سزاوارِ خطائے یک سوالم

(ولی الدین)

تو اسیرِ نکتۂ کن ہوا تری شان جلّ جلالہٗ
تو ضمیرِ سترِ فکاں بنا تری شان جلّ جلالہٗ

تو متاعِ نور تھا نور کا تو ہی کنزِ مخفی کا راز تھا
سرِ بام آ کے کھڑا ہوا تری شان جلّ جلالہٗ

کیا زیب تن تری ذات نے رخ جلوہ اپنی صفات کا
تو وجودِ کون و مکاں ہوا تری شان جلّ جلالہٗ

ہوا خود نمائی کا شوق تو مجھے اپنی شکل بنا دیا
دیا حکمِ سجدہ اسی جگہ تری شان جلّ جلالہٗ

مجھے شرف بخشا ہے ازل میں کہ میں نورِ ہدیٰ ہوا
یہ جزائے قالو بلیٰ ملی، تری شان جلّ جلالہٗ

تو کریم ہے تو رحیم ہے تو ہی وجہِ عین الیقین ہے
مجھے اک بہانہ بنا دیا تری شان جلّ جلالہٗ

کہیں تیرا روئے جلال ہے کہیں نقشِ رنگِ جمال ہے
ترا حسن رنگ میں چھپ گیا تری شان جلّ جلالہٗ

تو ہی لا الٰہ، تو ہی الا اللہ تری شان جلّ جلالہٗ
تو سب ہی کا ہے اور وہ کی ترا تری شان جلّ جلالہٗ

(ولی الدین)

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے
وہ دل میں بس گئے ہیں ہمارے نصیب سے
جسم میں کے بدلے ذکر تو ہی تو کا ہو گیا
پردے دوئی کے اٹھ گئے دور و قریب سے
اقرا باسم ربک ایسا سبق دیا
عالم تمام گونج اٹھا ذکرِ حبیب سے
فرمایا نَحْنُ اَقْرَبُ حَبْلِ وَرِیْد جب
پھر کیسے دیکھوں ان کو میں اتنے قریب سے
آتا نظر یہ ہے کہ وُہ ہی میں ہوں وُہ ہی وُہ
کچھ کھیل کھیلتے ہیں عجیب و غریب سے
انا الیہ راجعون رحمت کی شان ہے
کیا بات بن گئی ہے ہمارے نصیب سے
یہ حکمِ فَاذْکُرُونی ہے یا شوقِ اُذْکُرُکُمْ
پردے دوئی کے کھولے ہیں طرزِ عجیب سے

(ولی الدین)

باب ۱
ظہور

انسانی تاریخ میں کئی دور گذرے ہیں اور ہر دور میں ایک نہ ایک ہادی، پیغمبر، اوتار اور مجدد ضرور آیا ہے۔ قومیں کس طرح بنتی ہیں ان کا بچپن کس طرح شروع ہوتا ہے۔ ان کی جوانی میں کیا ہوتا ہے۔ ان کی پیری کیسے آتی ہے اور کیوں آتی ہے۔ جاہل قومیں ایک پیغام اور مشن لے کر ساری دنیا پر کس طرح چھا جاتی ہیں۔ پیغام اپنی جگہ پر ہوتا ہے۔ ان میں نوجوان بھی ہوتے ہیں ان کے خون میں گرمی بھی ہوتی ہے اور جوش عمل بھی مگر پھر بھی وہ زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور اس طرح مٹ جاتی ہیں کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔ ان کی کہانیاں تک فنا ہو جاتی ہیں۔ ایسی قوموں کا بھی سراغ ملتا ہے جو ہزاروں سال سے بے نام و نشان سادہ اور مختصر زندگی گذار رہی ہیں مگر ان میں اچانک ایک ایسا فرد پیدا ہو جاتا ہے جو اس قوم کی روح طفلی کو جوان کر دیتا ہے اور وہ حسن کی روشنی کی امنگوں کے ساتھ دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا جاتی ہے۔ ایسی قومیں بھی ہوتی ہیں جو تہذیب و تمدن کے

سیلاب میں بہہ کر وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں "صراطِ مستقیم" کا تصور بھی نہیں آتا اور ان میں اخلاقی اور روحانی امراض دق اور جذام کی طرح داخل ہو کر انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ ایسی قومیں بھی پائی جاتی ہیں جو اپنے شعور اور ادراک کے بل بوتے پر فطرت کی طاقتوں پر تسلّط حاصل کرنے میں اس طرح غلطاں و پیچاں ہوتی ہیں کہ خالق فطرت کو بھول جاتی ہیں اور اپنی زندگی کے طرزِ عمل سے غفلت برتنے لگتی ہیں۔ بعض قوموں میں فرد و ملّت کی جدوجہد کی ترازو کا کبھی ایک پلّہ بھاری ہوتا ہے تو کبھی دوسرا۔ سیاست کے ایسے قانون بنائے جاتے ہیں جس میں فرد کی اہمیت نہیں ہوتی اور قومی اقتدار کی خاطر عالمگیر جنگیں شروع ہو جاتی ہیں اور لاکھوں انسان جن میں سے ہر ایک اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ بجائے خود ایک قوم کہلایا جائے گا جرمولی کی طرح کاٹ دئے جاتے ہیں۔ جہاں انفرادیت کا پلّہ بھاری ہوتا ہے وہ لوگ ملّت اور اجتماعیت کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جس طرح ہر فرد کا رنگ و روپ جدا، کیریکٹر اور خیالات اور نصب العین مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر قوم کا کیریکٹر، راہِ عمل اور نصب العین بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ علاوہ سیاسی اور معاشرتی نقطہ نگاہ

کے علمی دنیا میں بھی ہر زمانہ کے فلاسفر، شاعر، آرٹسٹ اور معلّم جدا جدا اپنا اپنا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی یہ ماحول کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی ماحول کے تضاد میں کبھی ماحول کی خامیاں ان کی ذات سے توازن میں آتی ہیں اور کبھی یہ خود ماحول کی منتشر قوتوں کو اپنے مرکز پر جمع کر کے ایک رُخ اور راستہ پر لاتے ہیں۔

جب یونانی فلسفہ کا تعلق اسباب سے ہٹ کر توہّم پرستی میں بس گیا اور حسن کے باطن پر حسن ظاہر کا ایک آہنی پردہ پڑ گیا تو سقراط نے جنم لیا جس کی ظاہری صورت اتنی قبیح تھی کہ بچّے ڈر کر بھاگ جاتے تھے مگر باتیں ایسی شیریں اور اتنی دلکش کہ صرف دو چار ہی باتوں کو سُن کر لوگ مرید ہو جاتے تھے۔ اس نے ان تمام توہمات اور عقائد کو جو صدیوں سے حقیقت کی شکل میں ڈھل گئے تھے فہم اور ادراک کی کسوٹی پر گھس کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس نے بتایا کہ فطرت اور کائنات حق کی ایک کتاب ہے اور ان سب کا تسلسل علّت کی کڑی ہے۔ اس نے بتایا کہ خواہ کوئی چیز ساکن ہو یا متحرک۔ جاندار ہو یا بیجان اگر اس کی حقیقت تک علّت اور اسباب کی کڑی مل جائے

تو اس کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ بت پرستی اور توہم پرستی کے دور میں پیدا ہوا۔ مگر ماحول کی زبان بولتا تھا۔ ماحول ہی کے تصورات کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ افلاطون یا اس کے دو چار شاگردوں نے اس کے باطن کو پا لیا تھا۔ مگر دوسروں کے لئے اس کا وجود ایک سخت مصیبت تھا۔ صدیوں کے پرانے رسم و رواج، خیالات اور عقائد کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ قوم کب اس کو گوارہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ جسے اس نے خوشی خوشی پی بھی لیا اور شہادت پائی۔ شہید کبھی مرتے نہیں۔ آج یورپ جو مادی تہذیب میں حیرت انگیز کرشمے دکھا رہا ہے اسی شہیدِ حق کی قربانیوں کا صدقہ ہے۔

جب سلطنت روما اپنے فوجی اقتدار اور بے پناہ اجتماعیت کی بنا پر سارے عالم پر چھا گئی تو جناب مسیحؑ عشق و محبّت کا پیغام اور ہر بیکس و مسکین کے دل کی اہمیت کا احساس لے کر ظاہر ہوئے اور ظاہر پرستوں کے تصوّر میں بقول انکے صلیب پر چڑھا دیئے گئے۔ مگر آج دنیا میں مروّت اور باہمی محبت اور غریبوں کی دلجوئی اور فرد کا ذات سے تعلق کا احساس مسیح علیہ السلام ہی کا مرہونِ احسان ہے۔

ہندوستان میں جب برہمنی تصوف باطنی اصلاح اور فنائیت کی راہ سے ہٹ گیا اور رسوم وعبادات کی ظاہری اور رسمی پابندی کا خول ہی خول رہ گیا تو بدھ اٹھا جس نے سمجھایا کہ انسان کا اصل مقام اس کا جسم، اس کی عقل، اس کا شعور نہیں ہے بلکہ انسانیت کا ارتقا اس کا مقام ہے اور روح کو بیدار کرنا اور اس کو پا جانا اس کی حیات کا مقصد ہے۔ وہ ایک شہزادہ تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی توقیر تھی۔ اس کی زندگی تو اچھی کٹ گئی مگر اس کے بعد ہزاروں بدھ مذہب کے پیرو شنکر آچاریہ کے عَلَم کے نیچے تہ تیغ کر دیئے گئے۔

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور بزرگوں کے متعلق یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ کون سا ماحول کس شخصیت کو کس وقت پیدا کرتا ہے تو یہ بحث الگ ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ عرب کی تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ عرب کا ماحول وہاں کی قوموں کی ظاہری برائیاں اور سوئی ہوئی باطنی خوبیاں پھر ان میں ایک مقدس ہستی کا ظہور جو ہمیشہ کے لئے کافی اور شافی ہے یہ سب کچھ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔

سائنس والوں کا کہنا ہے کہ اس کرہ زمین کو وجود میں آئے

ہوئے تیس کروڑ سال ہوئے اور زندگی کی پہلی علامت جو پانی میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی شکل میں ظاہر ہوئی اس کو تین کروڑ سال گذرے ہیں۔ زندگی کی تدریجی ارتقاء میں مادہ اور قوت کے باہمی توازن سے ایک تیسری چیز بنتی ہے جس کا کوئی مستقل نام ابھی سائنس نے تجویز نہیں کیا۔ اس کو کبھی شعور کہتے ہیں اور کبھی جان یا روح اور پھر زینہ بزینہ اور منزل بمنزل ترقی کرتے کرتے انسانی حالت میں آکر یہی قوت ایک خاص شکل تک پہنچتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک خود انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ تین کروڑ سال یا جتنا بھی عرصہ لگا ہو۔ اس دوران میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور ان کے زیر سایہ ارتقائے انسانیت ہوتی رہی۔ غور کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ساری کاوش اور حیاتِ عالم کا مقصد اسی ایک رُخ پر چلتا رہا ہے۔ مادی ذرّات کی بے پناہ تیز رفتاری، زلزلہ اور طوفان کے قیامت خیز اثرات، موسموں کی نرم اور دھیمی چال، چاند کا گھٹنا اور بڑھنا، سورج کا طلوع اور غروب، بہار اور خزاں، سمندر اور خشکی کی لاکھوں قسم کی مخلوق، زندگی کی روزمرّہ کی کاوشیں، جنگ و جدل، ملکوں کی تاراجی، قوموں کا عروج و زوال اور بقائے نسل کی تدبیریں یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ صرف ایک مقصد کے لئے تھا

اور مقصد یہ تھا کہ "انسان حق کو پہچانے اور حق تک پہنچے"۔ عالم وجود کے آئینہ میں ایک ایسا رُخ بھی ظاہر کرنا تھا جس کا باطن خود آپ تھا۔

باطن سے ظاہر کا وجود ہوتا ہے۔ کیونکہ روشِ کائنات مرکز سے دائرہ کی طرف چل رہی ہے، قدرت ایک ہستی کو مرکزِ تخلیق بنانا چاہتی تھی اور اُسے بشریت کے رُوپ میں پیش کرنا چاہتی تھی۔ تعجب کی بات نہیں اگر پہاڑوں نے زمین اور آسماں نے قدرت کی اس امانت کو قبول کرنے سے خوف کھایا اور انکار کر دیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشود

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(آسمان امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا۔ تو فال کا قرعہ مجھ دیوانے (انسان) کے نام نکال دیا گیا)

یہ عظیم امانت۔ یہ عظیم شے کا باطن نورِ محمدی ہے۔ یہ ازل سے چلا تھا اور منزلیں طے کرتا ہوا آدم کی پیشانی پر جلوہ فرما ہوا۔ یہی موسیٰؑ کے جلال میں چمکا۔ اسی نے عیسیٰؑ کے عشق میں گرمی پیدا کی۔ یہی تھا جس نے ارسطو کی عقل کو سہارا دیا۔ جو لقمان کی حکمت بنا اور جس نے بدھ کو سعادت بخشی۔ گویا اس طرح قالب کی تکمیل ہوتی رہی یہاں تک کہ لم یلد ولم یولد کے لئے ایک

ایسا سانچہ تیار ہوا جس میں وہ سما سکے۔ بالآخر یہ ذاتِ نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روپ میں ظہور پذیر ہوئی۔ اور اس عظیم مقصد حیات کی تکمیل کروڑوں سال کے مدّوجزر کے بعد آپ کی باوقار ذات میں قیام پذیر ہوئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم (آج کے دن مکمل کر دیا تمہارا دین تمہارے لئے) وہ نور جو ہر حرکت اور ہر زندگی اور ہر وجود کا باطن ہے رسول مقبولؐ تک پہنچا اور وہیں مقیم ہو گیا۔ سردار کونین کا پیغام اور مقصدِ حیات کیا تھا؟ وہ دنیا میں کیوں تشریف لائے اور کیا کر گئے۔ ان پاکیزہ تفصیلات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

کہ سر خم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(آسمان کے نیچے ادب کی ایک وہ جگہ بھی ہے جہاں جنید و بایزیدؒ (جیسے بڑے مرتبہ والے) بھی سر جھکا کر آتے ہیں)

لیکن کیا وہ نور آنحضرتؐ کے جسم اطہر کے ساتھ زیر زمین پوشیدہ ہو گیا۔ فرمان باری لولاک لما خلقت شاہد ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سورج اور چاند، زمین اور آسمان سب فنا ہو جاتے۔ جب بحکم ربی حضرت جبرائیل نے رسول اللہ کو بھیجا تو

اُمّی ہونے کے باوجود آپ کا سینہ علم و عرفان کا سمندر بن گیا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو اپنے سینہ سے لگایا۔

انا مدینۃ العلم و علی بابھا

(میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ)

کی بنیاد رکھی اور وہ دولت سرمدی سینہ بہ سینہ اسی طرح آرہی ہے اور تا ابد چلتی رہے گی۔ یہ وہ راز ہے جسے فقرا اپنے سینہ میں چھپائے رکھتے ہیں اور عصمت و عفّت کی طرح اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں خصوصاً اور تاریخ انسانیت میں عموماً پچھلے چودہ سو سال میں کتنی ہستیاں اس کی متحمل ہوئیں۔ وہ کس ماحول میں اُٹھیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں کیا کارہائے نمایاں کئے۔ اس کی تفصیل ایک اور کتاب بن جائے گی۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے سوئی ہوئی قوم کو کس طرح جگایا۔ کس طرح رُوحانی بیماریوں کے معالج بنے۔ بشر اور رب کے ٹوٹے ہوئے ناتے کو کیسے جوڑا۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے توحید کی کثرت کو کس طرح وحدت کی یک رنگی میں پیش کیا۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خودبیں

حضرت مجددؒ الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے تصوؔف کے جامے سے گرد کیسے جھاڑی، حضرت بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے باطنی دنیا کے نظام کا کونسا ڈھانچہ تیار کیا۔ حضرت محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ نے دہلی سلطنت کی کج کلاہی کو کیسے درست کیا۔ حضرت مخدوم صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ نے کیسے یہ ثابت کیا کہ عاشق کی ہٹ بھی مشیت کے ظرف سے باہر نہیں ہے۔ حضرت وارث علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے کیسے ارواحِ خبیثہ کی پرستش اور ان کی قوتوں کے تسلّط کو ختم کر کے خودی کو رضائے الٰہی میں ضم کرنا سکھایا۔ حضرت بابا تاج الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ نے کس طرح جسم اور روح کی "میں" اور "تو" کی دوئی کو ہٹا کر سچی توحید کا رنگ رچایا۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر کوئی باطن میں غرق ہو جائے تو یہ ساری باتیں آپ ہی آپ سمجھ میں آجائیں گی۔

کن فیکون سے پہلے

یک زماں بود کہ من فکر معلق بودم
نازشِ دہر بہ گہوارۂ فطرت بودم

کنز مخفی و وجودے بہ نمودے بودم
لائقِ کار گہِ بزم نمودے بودم

سرِؔ امر ابھی میں کن فیکوں سے پہلے
حد اف کار تھی میں کن فیکوں سے پہلے

پیک بیکار تھی میں کن فیکوں سے پہلے
خطِ پرکار تھی میں کن فیکوں سے پہلے

بزمِ توحید میں کب میری سمائی ہوتی لامکاں خود ہی تھی میں کن فیکوں سے پہلے

******

در مقامے کہ خدا بود محمدؐ دیدم
نقش بر عرش الہٰ را بہ محمدؐ دیدم

منبعٔ نورِ الہٰ نورِ محمدؐ دیدم
للہ الحمد خدا را بہ محمدؐ دیدم

محوِ تنویر تھی میں کن فیکوں سے پہلے
ھو کی تفسیر تھی میں کن فیکوں سے پہلے

نقشِ دلگیر تھی میں کن فیکوں سے پہلے
گویا تصویر تھی میں کن فیکوں سے پہلے

اسو دی نور تھی میں کن فیکوں سے پہلے
لمرء نور تھی میں کن فیکوں سے پہلے

پر قسم کھا کے احد کی میں کہوں گی احمدؐ
تم پہ بلہار تھی میں کن فیکوں سے پہلے

****

در مقاماتِ جنوں نام محمدؐ گفتم
قبل از کن فیکوں نام محمدؐ گفتم

از ھوالاول و آخر بہ محمدؐ گفتم
شوق ایں بود کہ درپردہ محمد گفتم

امرِ بے چون تھی میں کن فیکوں سے پہلے
کافِ بے نون تھی میں کن فیکوں سے پہلے

نکتۂ رازِ ازل آن ہوالاول تھی
لم یزل ذات تھی میں کن فیکوں سے پہلے

عشق میں نام محمدؐ کا لئے جاتی تھی
روح قدس تھی میں کن فیکوں سے پہلے

سالہا سال کی گردش میں ہوئی ہے دیری
عازم سفر تھی میں کن فیکوں سے پہلے

پاس احکام تو ایں قدر بہ ظاہر کردم
رازِ باطن عصیاں در نفس خود کردم

وحدت ذاتِ وجودے و صفاتے کردم
نقد جاں شانِ نزولِ دلِ قرآں کردم

قادرِ مطلق و قیوم تھی ذاتِ باری
جانِ یزداں تھی میں کن فیکوں سے پہلے

داخلِ پردہ وحدت جو ہوئی تھی کثرت
اس میں ملفوف تھی میں کن فیکوں سے پہلے

قرن تا قرن سے میں صل علیٰ کہتی تھی
جانِ فرقان تھی میں کن فیکوں سے پہلے

اب کھلا مجھ پہ ولی احسنِ تقویم کا راز
راز جو راز نہ تھا کن فیکوں سے پہلے

(ولی الدین)

تمہاری آن افلاکی	تمہاری شان لولاکی
تم ہی ہو کنزِ مخفیاً	شبیہہ پاک مولیٰ کی
نشانِ والضحیٰ تم ہو	تم ہی تفسیر طٰہٰ کی
تم ہی سے سیّد عالم	ہویدا شان اللہ کی
منوّر ہو گئی تم سے	زمینِ پاک طیبہ کی
سلامِ مرسلیں تم پر	سلامِ نوری و خاکی
سلامِ بے کساں تم پر	سلام چشم تمنا کی
ولی کے چارہ گر مونس	مسیحائے دلِ پا کی
ولی نے جب تمنّا کی	تمہاری ہی تمنّا کی

(ولی الدین)

جہاں میں ہر طرف جلووں کی ہے اتنی فراوانی
کہ سینہ میں کھٹکتی ہے نگاہ و دل کی ویرانی

نہیں آسان گلچینی گلستاں میں محبت کے
وہاں پھولوں کی ارزانی یہاں کانٹوں کی ارزانی

فقیری بندگی کے روپ میں شانِ خداوندی
یہی ہے رازِ درویشی یہی رمزِ جہانبانی

یہ فیضِ لاالٰہ تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
بتائے دار پر منصور نے اسرارِ ربانی

جسے راس آگئی آب و ہوائے آرزومندی
وہ ہے کردار میں گفتار میں اعجازِ قرآنی

جنید و بایزید و شمس تبریز و معین الدین
تری محفل میں جب پہنچے کیا اقرارِ نادانی

فقیہِ شہر سے کہہ دو یہ ہے میخانۂ عرفاں
متاعِ ہوش کھو کر اس جگہ ملتی ہے حیرانی

جہاں ماو تو سے ماورا ہے عالمِ الفت
یہاں نوری بھی ناری ہے یہاں ناری بھی نورانی

سکھائے مجھ کو پروانے نے انداز براہیمی
مجھے بیچین رکھتی ہے ہر اک شعلے کی تابانی

بحالِ زاری آیم بہ پیشِ حضرتِ قادر
چہ خواہد ایں مریضِ جاں بلب واللہ تو میدانی

(رحمٰن بابا)

زمانہ حال۔ چودھویں صدی   باب ۲

ہر زمانہ میں کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں" یہ زمانہ بہت بُرا ہے"۔ "اگلے وقتوں کے لوگ اچھے تھے"۔ پچیس سال پیشتر کی بات ہے کہ یونان میں آثارِ قدیمہ کے سلسلہ میں کھدائی ہو رہی تھی تو ایک کتبہ نکلا جس پر لکھا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ (کتبہ کی عمر کم از کم آج سے تین ہزار سال قبل کی ہو گی) نہایت خراب ہو گیا ہے۔ بدکاری اتنی بڑھ گئی ہے کہ زمین کے تختے الٹنے والے ہیں اور قیامت آنے والی ہے۔ لوگو ہوشیار ہو جاؤ۔ اور اپنے معبود کی طرف رجوع کرو"۔ اسی طرح ہر زمانہ کے مکتوبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ حال کے شاکی تھے اور ماضی کے مدّاح۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وقت کے گذرنے سے روزمرہ کے نشیب و فراز ہموار ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے دور سے پہاڑیاں خوشنما اور ہموار معلوم ہوتی ہیں مگر جب ان کے راستے طے کیجیے تو پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔

زمانہ کی یہ شکایت بجا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ چونکہ زمانے بدلتے رہتے ہیں اس لئے بدی اور لپستی کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ ایک ڈیڑھ صدی پہلے کی بات ہے یورپ میں کسی عورت کی اگر کلائی بھی نظر آجاتی تو بیحیائی تصوّر کی جاتی تھی۔ مگر آج ایسا نہیں ہے۔ یونانی تہذیب میں قوم کے تسلیم کئے ہوئے حسین بُت کو اگر کوئی حسین تصور نہیں کرتا تھا، تو وہ گنہگار اور لعنتی کہلاتا تھا۔ روما کے نظام میں غلاموں پر ظلم کرتے ہوتے کسی کے دل میں اگر درد پیدا ہوتا تھا تو یہ اس کی اخلاقی کمزوری مانی جاتی تھی۔ غرض یہ کہ ہر زمانہ کا قانون جدا تھا معیارِ زندگی جداگانہ تھا۔ اور زندگی کی روش علیحدہ تھی۔

ایک ضعیف روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے ایک موقعہ پر آنے والی تیرہ صدی تک کی روش کے متعلق مختلف ارشادات فرمائے۔ مگر جب چودھویں صدی کے متعلق پوچھا گیا تو آپ خاموش رہے۔ زمانہ حال کو چودھویں صدی کہا جاتا ہے۔ جہانتک بصیرت ساتھ دیتی ہے میں آپ کے سامنے اس کی خوبیاں اور خرابیاں، اس کا ظاہر اور باطن اور اس کی روش کا خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد علّت اور معلول کی طرح صاحب وقت

کی صفات خود بخود سامنے آجائیں گی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ صاحبِ وقت کیسا ہوتا ہے۔ حضرت قبلہ بابا قادر اولیا صاحب وقت کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ ان کا مقصدِ حیات کیا ہے، پیغام کیا ہے اور ان کی عملی زندگی کیا کہتی ہے اور ان کی شخصیت و سیرت کی روشنی کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔

بابا صاحب قبلہ جب اپنے حجرے میں تشریف فرما ہوتے ہیں اور ان کے پاس صرف دو ایک خاص خادم ہوتے ہیں تو انہیں تفکّر کرتے اور سمجھانے کے لئے آپ کو اکثر کہتے ہوئے سُنا گیا ہے کہ "میں کون ہوں، کس لئے یہاں آیا اور کیا کر کے چلا"۔ ان سوالوں کا جواب مجھ جیسے آدمی کے لئے قطعی ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ہر صاحبِ خدمت کی بات اسی کے مقام پر پہنچ کر ہی پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

آج کل آمدورفت کی سہولتوں کی وجہ سے ساری دنیا ایک شہر کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ہر محلّہ اپنے رنگ میں جداگانہ ہے۔ اسی طرح مختلف قوموں کا حال ہے عملی اعتبار سے ان کا ایک ہی رنگ ہے اور چودھویں صدی کی یہی پہلی خصوصیت

ہے۔ اس کا آغاز تو شیطان کی نہایت ہی لطیف تحریک یعنی عجلت پسندی کی وجہ سے ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدمی کا مقام انسانیت کے مرتبے سے گھٹ گیا۔ زمانہ حال کی عجلت پسندی کی تفصیل کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سفر برسوں میں کٹتا تھا وہ اب گھنٹوں میں کٹنے لگا ہے۔ اور اب فکر اس بات کی ہے کہ منٹوں میں کٹے۔ خبر رسانی اور معلومات کے نشر کا یہ انتظام ہے کہ کوئی واقعہ دنیا کے کسی گوشہ میں کیوں نہ ہو اس کا علم ہر کس و ناکس کو آناً فاناً ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت اور حصولِ علم کے لئے بھی ایسے ہی عجیب و غریب طریقے ایجاد ہو گئے ہیں کہ برسوں کی محنت سے جو نتیجہ حاصل ہوتا تھا، وہ اب مہینوں میں ہو جاتا ہے۔ ان سہولتوں کی وجہ سے دنیا کا سکون و قرار جاتا رہا ہے اور وقت جو کہ حیات کا سرمایہ ہے اور جس کے استعمال سے انسان کو روحانی لذت اور خوشی حاصل ہونی چاہیئے تھی اب اس کے لئے ایک بوجھ بن گیا ہے۔ آپ ہر تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی کی زبان سے یہی سنیں گے کہ وقت نہیں کٹتا۔ آدمی ایک تفریح سے دوسری تفریح کی طرف لپکتا ہے اور تفریحات میں نت نئی جدتیں پیدا کرتا ہے مگر حظ اٹھانے کا مادہ روز بروز کند ہوتا جاتا ہے۔ اور اسی لئے مغربی ممالک میں خودکشی کرنے والوں اور پاگلوں کی تعداد تیزی کے ساتھ

بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی تہذیب کو مخاطب کر کے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

عجب این نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

زمان و مکان کی قید سے رہائی کا یہ الٹا طریقہ شیطان کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہے۔ اس حدیث کی طرف غور کیجیے۔

آلتعجیل من الشیطان والتانی من الرحمٰن

(جلدی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور سلامت روی رحمٰن (خدا) کی طرف سے)

اور پھر اس کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالیے۔ شیطان کی پیروی میں رحمٰن سے ہم بہت دور ہو گئے۔ ہر چند کہ رحمت کا یہ تقاضا ہے اور وہ بیچین ہے کہ گمراہ بندوں کو اپنی گود میں لے اور سکون و قیام بخشے۔ مگر جب قدم ہی نہ اُٹھتے ہوں اور رُخ بھی ادھر نہ ہو تو ہم کس طرح رحمٰن کی رحمتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

شیطان لعین کا دوسرا کرشمہ ڈارون کی شکل میں نمودار ہوا یہ تو محض ایک مذاق کی سی بات ہے کہ ڈارون نے بندر کو انسان

کا مورثِ اعلیٰ ثابت کیا ہے۔ اس نے تو ارتقاء کی کڑیوں کو ایک نظم میں جوڑ کر سلسلۂ حیات کا ربط ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش صحیح ہو یا غلط اس کے متعلق کوئی رائے دینا غیر ضروری ہے۔ مگر جو شیطانی اثرات اس کی تعلیمات سے انسانی ذہن و فکر اور عمل و کردار میں رونما ہوتے وہ جہد للبقا کا فلسفہ ہے۔ یعنی یہ کہ ماحول ہر فرد کے نشو و نما کا دشمن ہے، اور اس سے جہد اور اس پر تسلّط حاصل کرنے سے ہی ہم تسلسلِ حیات کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ خود پرستی یا نفسِ امّارہ ڈارونی تہذیب کا خداوندی نہیں بلکہ معبودِ حقیقی ہے۔ اس شیطانی نظریہ کے تحت اپنی بلندی، اپنا قیام، اپنے آرام کے لئے ہر عمل کو انسان صالح سمجھتا ہے اور ہر اس فلسفہ کو جو اس نصب العین کو تقویت دے وہ اپنا مذہب قرار دیتا ہے۔ چونکہ فرد و ملّت کی باہمی یک جہتی کے بغیر اس وسیع کائنات پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بظاہر تعلیم میں سماجی شریعت کا ایک ظاہری خول موجود ہے۔ لیکن یہ فلسفہ اس قدر نازک اور لطیف شیطنت سے بھرا ہوا ہے کہ الہامی شریعت اور انسانی شریعت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ موجودہ سیاست میں جمہوریت کا بہت

بول بالا ہے اور اچھے اچھے مدبّر اس کو انسانی تہذیب و تمدن کا ایک اعلیٰ ثمر سمجھتے ہیں۔لیکن ان کا یہ خیال ایک مغالطہ ہے۔ کیونکہ الہامی بھائی چارہ اور مساوات جس کی طرف ہر سچے مذہب نے دعوت دی ہے کچھ اور ہی چیز ہے جس کا سراغ صرف فقراء، اولیاء اور موحدین کی زندگیوں میں ملتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر فرد ایک دوسرے کے مرکزِ حق ہونے کی شہادت دے۔

جہد للبقا کے فلسفہ کا یہ اثر ہوا کہ انفرادی حیثیت سے ہر شخص نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام بلند کرنے کے لئے مکر و فریب اور ظلم کو جائز ہی نہیں قرار دیا بلکہ ضروری سمجھا۔ اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم اپنے عروج کے لئے دوسری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا نہ صرف جائز سمجھتی ہے بلکہ ایک امر صالح بھی تصوّر کرتی ہے۔چنانچہ اس تحریک کا اثر یہ ہوا ہے کہ فطرت سے ہم آہنگی اور رب العالمین سے راضی رہنے کے معنی ہی ہمارے ذہن اور فہم سے باہر ہو گئے ہیں۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو کھویا ہوا پاتا ہے۔ خالق سے ربط تو دور کی بات ہے مخلوق سے بھی اس کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہ تنہائی کی ظلمت میں بغیر کسی تعین راہ کے اس طرح کودتا پھرتا ہے جیسے بھاڑ

میں چنا۔ ایک دفعہ ناگپور میں ایک بزرگ سے کسی صاحب نے ولایت جاکر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے فرمایا کہ بندروں کے ملک سے تم کیا پاؤ گے۔

ان کا یہ کہنا بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آیا۔ یورپ کا باطن بالکل بندر کا سا ہے۔ ہنومان کی سی شکتی اور طاقت تو ضرور ہے مگر انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ شجاعت اور مروّت شرافت اور اخلاق، ہمدردی اور دلجوئی۔ یہ اور اس قسم کی دوسری چیزیں بندروں میں نہیں پائی جاتیں۔ بندر بھی یک جہتی سے کام کرتے ہیں، اور فرد و ملّت کے قیام کے سارے راز انہیں طبعی طور پر حاصل ہیں، مگر سب سے نمایاں اور انسانیت کے معیار سے گری ہوئی خامی جو اُن میں پائی جاتی ہے وہ بے حیائی ہے۔

حیات اور حیا ہم مفہوم لفظ ہیں۔ اور حیا اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ اور ایمان ہی انسانیت کا جوہر اعلیٰ ہے۔ جیسے بغیر آب کے ہیرا شیشہ کا ٹکڑا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے بغیر انسان محض جانور ہو کر رہ جاتا ہے۔ بے حیائی سے مراد عورتوں کی بے پردگی نہیں ہے بلکہ اصل بے حیائی ایمان کا کچاپن ہے۔ حیا انسانیت کا جزو اعظم ہے۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ حسن، اقتدار کے

وقار کی خاطر سر بازار بکتا ہے۔ اگر کوئی مقرّر اچھی تقریر کرتا ہے تو اس کا معاوضہ جب تک ایک ہنگامے کی شکل میں وصول نہیں کر لیتا اس کو کوئی لطف نہیں آتا۔ انتہا یہ ہے کہ اگر کسی کو عشق بھی ہو گیا تو جب تک وہ اس کا چرچا نہیں کر لیتا اسے مزا نہیں آتا۔ بےحیائی کا رنگ اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ اپنی حیات سے بھی یقین اٹھ گیا ہے۔ جب تک سارا عالم انگلی دکھا کر یہ نہ کہے کہ تم زندہ ہو اسے اپنے وجود پر خود یقین نہیں آتا۔ وہ باطن کا ثبوت ظاہر سے طلب کرتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ جینے کا مزا خود جینے میں نہیں آتا بلکہ جینے کی تکرار سے آتا ہے۔ حقیقی خودی جس کی طرف علامہ اقبال نے ضربِ کلیم کے زور سے انسانوں کو متوجہ کیا ہے۔ اس بےحیائی سے مردہ ہو جاتی ہے۔ اس بےحس ماحول میں خود کوئی اچھا بھی ہوتا ہے تو اس کو اپنی اچھائی پر اس وقت تک اعتماد نہیں ہوتا جب تک کہ دوسرے اسے اچھا نہ کہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ انسانیت کے ادراک سے بنیادِ وجود اور مرکزِ حیات کا یقین تو کجا اس کا وہم تک ضائع ہو چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ دوئی کے بغیر نہ تو وجود ہی رہ سکتا ہے اور نہ ہی انفرادیت۔ جس کی عظمت آسمانوں سے بلند تر ہے۔ اور

جب تک کوئی دوسرا وجود مقابل نہ ہو ہر فرد کوشش سے بیزار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو کھویا ہوا سا پاتا ہے۔

غرض یہ کہ دل اور دل کی دنیا جو انسانیت کے لئے قدرت کا خاص عطیہ ہے اسی سے انسانیت آج محروم ہے۔ انسان کی زندگی سے دل کی کائنات کو علیحدہ کر دیجیے تو وہ دو ہاتھ اور دو پاؤں کا آدمی تو ضرور کہا جائے گا مگر غور سے دیکھا جائے تو کیا انفرادی پہلو سے اور کیا اجتماعی پہلو سے وہ جانوروں سے بھی بدتر نظر آئے گا چہ جائیکہ وہ احسن التقویم (بہترین بناوٹ) کے خطاب کے قابل بن سکے! خارجی طور پر خواہ کوئی بھی اصلاحی نظام جاری کیا جائے آدمی کو انسان نہیں بنا سکتا۔ چاہے وہ نظام جمہوریت کے لباس ہی میں کیوں نہ ہو۔ جب تک کوئی طاقت باطن کو نہ سنوارے انسان نہ تو اپنے وقار کو بڑھا سکتا ہے۔ نہ اپنی عظمت کو پا سکتا ہے اور نہ اپنی بلندی کا پتہ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ باطن کی کھڑکی دل ہی کی دنیا میں کھلتی ہے۔

خلوص، محبت، انہماکِ کار اور جذبہ ایثار، یہ دل کی دنیا کی چند گلیاں ہیں۔ مگر اس کی شاہراہ کچھ اور ہے۔ فقرا کا کام اور ان کا مشن یہ ہے کہ پہلے وہ طالبانِ حق کے دلوں کو جگائیں

اور اس میں یقین پیدا کرائیں۔ پھر اس کو حقیقت کے بے پایاں سمندر میں گم کر دیں اور حیّ و قیّوم کی منزل تک پہنچا دیں۔ ھوالحیّ القیوم۔ ایمان جوہر حیات ہے جس طرح جسم زلیست کا طالب اور پابند ہے اسی طرح زلیست بھی جوہر حیات کی پابند ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک پہیئے کو دھکّا دے کر چھوڑ دیا جائے تو وہ ماحول کے رحم و کرم کا سہارا لے کر ہر نشیب کو اپناتا ہوا لڑھکتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ آخری نچلی سطح تک پہنچ کر ٹھہر جائیگا۔ برعکس اس کے پہیئے میں اگر خود کوئی طاقت ہو جیسے کوئی انجن لگا ہوا ہو تو اس پہیئے کو جو نہ صرف متحرک ہی ہے بلکہ جاندار بھی ہے ہر نشیب سے نفرت ہوتی ہے۔ کیونکہ نشیب میں جانے سے اس کی باطنی طاقت پر الٹا اثر پڑتا ہے اور محرک طاقت کے طفیل یہ پہیّہ بلندی کی طرف خود بخود راستہ نکال کر بڑھنے لگتا ہے کیونکہ اس عمل سے انسان کی باطنی طاقت صرف میں آتی ہے اور اس چھپی ہوئی طاقت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ظہور میں آئے۔

اسی طرح بچّہ جب ماں کے پیٹ کے اندھیرے سے اس مثالی اجالے میں قدم رکھتا ہے تو اسے زندگی کا دھکّا ملتا ہے۔

سائینس کے ماہرین بتاتے ہیں کہ قیامِ زندگی کے لئے فطرت نے کیسے کیسے جتن کئے ہیں۔ کون کون سی طاقتیں جسم اور دماغ میں رکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ جسم اپنی شعوری طاقتوں کے باوجود اس پہیئے کی مانند ہے جو ابتدائی دھکے سے لڑھکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس کا تقاضہ ہے کہ وہ سہولت پسند ہو اور اس کی یہ طاقتیں محفوظ رہیں کیونکہ اس کی دنیا صرف اسی تک محدود رہتی ہے اور وہ ان طاقتوں کو پس انداز کرتا رہتا ہے۔ اور ٹھیراؤ ڈھونڈتا ہے۔ مگر ٹھیراؤ کے بجائے اسے غفلت کی نیند ملتی ہے۔ آرام کی دنیا تو مل جاتی ہے مگر اطمینان کی نعمت میسّر نہیں آتی اور جہاں اس کو فنا کی دولت ملنی چاہیئے موت کی تاریکی ملتی ہے۔

رازِ حیات قلب میں چھپا ہوا ہے۔ جب کسی روحانی طاقت کے طفیل دل کی کلی کھِل جاتی ہے تو پیدائش کے حادثے یا زندگی کے دھکے کا احسان ختم ہو جاتا ہے۔ اور آدمی اپنے دل کے اندر ایسی قوّت پاتا ہے جو اس کے جسم کو خود بخود انتہائی لذّت اور کیف کے ساتھ بلندی کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہے اور جب اس جوہرِ حیات یا ایمان سے رفتارِ زیست اور روشِ حیات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ مکمّل انسان بن جاتا ہے۔

زلیست کی کاوشیں چاہے وہ اعمال ہوں، اخلاق ہوں، علم ہو یا فہم ہو، سب قبر تک کے دھندے ہیں۔ دل جب مرکزِ حیات بن جاتا ہے تو لامحدود، غیر فانی اور ابدی و ازلی حقیقت کبریٰ کا آئینہ بن جاتا ہے۔ اگر زلیست اور حیات کی ہم آہنگی صحیح انداز میں میسّر آجائے تو آدمی حیاتِ ابدی کا مزہ اسی زندگی کے لیل و نہار میں پانے لگتا ہے۔ اور محدود جسم اور لمحاتی (momentary) زندگی کے حدود و قیود سے آزاد ہو کر لَم یَزَلْ کا آئینہ بن جاتا ہے۔ زندگی میں اگر روحِ انسانی ایمان کی روشنی سے محروم رہی ہے تو مرنے کے بعد اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ کیونکہ موت کے بعد عناصر تو عناصر سے مل جاتے ہیں مگر روح جس کی ارتقا اور نشوونما کے لئے جسم کا ایک عظیم احسان لیا گیا تھا اس جسم سے نکل کر بھٹکتی پھرتی ہے۔ بعض مذاہب کے عقیدے کے مطابق ایسی روحیں دوسرے قالب میں سما جاتی ہیں اور یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ مگر جن کے پاس ایمان کی پونجی ہوتی ہے وہ ان چکروں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ان کا سیدھا راستہ صراطِ مستقیم ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ راستہ ہم کو اس دنیا سے کسی اور دنیا میں لے جاتا ہے۔ زمین سے آسمان تک پہنچاتا ہے۔ اور

کشاکشِ زندگی سے نکال کر فردوس کی لذتیں بخشتا ہے۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ فقراء کا یہ کہنا ہے کہ یہ راستہ کہیں اور نہیں لے جاتا بلکہ اپنے آپ تک پہنچاتا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ مقامِ قلب کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہ راستہ اعمال سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ ایمان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس راستہ کو ہاتھ پاؤں اور دماغ کی حرکت طے نہیں کرتی۔ قلب کا ذکر طے کرتا ہے۔ یہ ایک نکتہ ہے، قرآن کریم آئینۂ کائنات ہے۔ سورہ اخلاص اس آئینہ کا صیقل ہے۔ بسم اللہ اس صیقل کی جلا ہے۔ "ب" کی کشتی اس جلا کا جوہر ہے اور "ب" کا نقطہ فقیر کے دل کا راز ہے۔

قرآن کریم نے بار بار مسلمین و مومنین کی تکرار کی ہے۔ مسلم کی دنیا عمل کی دنیا ہے اور اس کا خالق جو رحیم و کریم ہے ذرا کوشش و کاوش سے ستر گنا اجر دیتا ہے مگر ستر کروڑ گنا اجر بھی اس لامحدود کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن کی دنیا باطن کی دنیا ہے۔ اور عشق اس دنیا کی قندیل ہے۔ عشق بے طلب ہوتا ہے۔ بے نیاز ہوتا ہے اور خود بخود ہوتا ہے۔ اور باطن کی دنیا اسی کی دنیا ہے۔ کیونکہ اس میں وہ بسا ہوا ہوتا ہے اگر باطنی دنیا کا شعور حاصل ہو جائے تو ظاہر کی دنیا خود بخود

صالح ہو جاتی ہے اور جب ان دونوں کا امتیاز ختم ہو جائے تو آدمی مسلم بھی بن جاتا ہے اور مومن بھی۔ اور صدیق کا لقب پاتا ہے۔

چودھویں صدی کی دنیا میں ایمان کی جنس کمیاب ہو گئی ہے اس کا کوئی خریدار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن کے پاس یہ دولت ہے وہ اسے بہت ہی سستے داموں دے رہے ہیں۔ اگلے بزرگوں کی طلب، ان کے مجاہدے، ان کی ریاضت اور ان کی سخت کوششوں کی بجائے یہ نقارہ بج رہا ہے کہ "ہے کوئی لینے والا" ہم ایک لامحدود دولت، ایک بے پایاں لذّت، ایک عالمگیر وسعت، فانی مٹی کے پتلے کے معاوضہ میں بیچ رہے ہیں۔ جن کے دلوں میں کچھ کرید ہوتی ہے وہ آتے ہیں مگر ہوس کے سوا ان میں طلب نہیں ہوتی، اس لئے جھجکتے ہیں اور منہ موڑ کر لوٹ جاتے ہیں حضرت قبلہ بابا قادر اولیا کا یہ مشن ہے کہ عوام کو صرف مرکزِ حیات یعنی قلب کی طرف پیغامِ محبّت سے متوجہ کرتے ہیں اور ایمان کی سی دولت بے داموں سرِ بازار لٹاتے ہیں اور ایسوں کو بھی جن کے نصیب میں یہ دولت سرمدی نہ ہو، ادائے بے نیازی کی شان سے کچھ بخش ہی دیتے ہیں۔ اہلِ طریقت اسے پسند نہیں کرتے کہ ایسی گرانقدر دولت اور وہ روشنی جس کی حفاظت کے لئے زمانے نے مختلف قسم کی کروٹیں

بدلیں اس طرح سربازار بکھیری جائے۔ نہ مجاہدے ہیں نہ ریاضتیں، نہ خلوتیں ہیں نہ چلّے اور نہ کہیں وہ صدہا برس کی ظاہری اور باطنی تنہائی جو سکرات سے بھی بدتر اذیت دہ ہوتی ہے۔ یہاں تو ہنستے بولتے، کھاتے پیتے دنیا کو ایک مٹھی میں اور دین کو دوسری میں لئے ہوتے دونوں سے ماوراء کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ نہ تو نفس سے جہاد ہے نہ شیطان سے لڑائی۔ کچھ ہے تو شرابِ محبّت ہے جس کو ہضم کر کے سیدھے سادے بچوں کی طرح وہ منزلیں جو بیس تیس سال میں بھی نہ طے ہوتی تھیں، مہینوں میں طے کرتے گئے ہیں۔ یہ خالقِ حقیقی کا احسان ہے کہ اس زمانہ میں جب نفسی نفسی پڑی ہوئی ہے، نفس کو محبّت کے آغوش میں اپنا کر بغیر کسی دوئی کے آپ ہی آپ احسن التقویم (بہترین ترکیب کی بناوٹ) بنے چلے جاتے ہیں۔

آمنوا وعملوا الصالحات (ایمان لاؤ اور عمل صالح کرو)

قرونِ اولیٰ کے سادہ مزاج لوگوں کا جائزہ لیجئے۔ چند برسوں میں اسلام کی روشنی کے گھر گھر پہنچ جانے کے حیرت انگیز اثرات کو دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ ایمان کیا چیز ہے اور ذوالفقارِ علیؓ کیا چیز تھی جس نے خلفائے راشدین کے زمانے میں اسلام کی

روشنی بجلی کی طرح پھیلا دی۔ علی شیرِ خدا۔ مجسمہ ایمان۔ فقیروں کے سرتاج جن کے دروازے سے ہر ایک کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی آج بھی اس نام میں وہی برکت ہے کہ یا علی کا ایک نعرہ لگائیے اور گوہر مراد سے جھولی بھر لیجئے۔ یہیں سے نورِ محمدیؐ عیاں ہوتا ہے اور مختصر سیدھا راستہ دکھائی دیتا ہے جسے فقیر پلک جھپکاتے طے کرا دیتا ہے۔ یہیں سے علم و عرفان کے دروازے کھُلتے ہیں اور جتنی بھی الہامی کتابیں ہیں ان کے رموز و اسرار خود بخود ظاہر ہونے لگتے ہیں اور جتنے بھی عاشقانِ دین گذرے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ اور کیفیت اپنے آپ پر سے گذر جاتی ہے۔ اسمِ اعظم کے ذریعہ سے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اسمِ اعظم وہی ہے جو کسی کے دل میں لبسا ہوا ہو اور دل خود بخود اس کا وِرد کرتا رہتا ہو۔ اسم اور وجود کا تعلق اور پھر اسم سے ماورائے ذات یہ سارے راز ایک خوشبو کی طرح دل سے خود بخود پھوٹ کر نکلنے لگتے ہیں خوش نصیبی ہے کہ آج بھی ایک چودھویں صدی کے بزرگ بابا قادر اولیا اسلام کی اسی پہلی سادگی اور سچائی کے ساتھ اسلاف کے کارناموں کی تجدید فرما رہے ہیں۔

ہوش و خرد کو شوق میں ہارے چلے گئے
اور نقدِ جاں بھی نذر گزارے چلے گئے

یوں کھو گئے ہیں جا کے تری جلوہ گاہ میں
اپنے کو بے خودی میں پکارے چلے گئے

انسانیت پہ آج بھی ہیں ظلمتیں محیط
کیا طورِ زندگی کے شرارے چلے گئے

خونِ حسین کی ہے صدا ریگ زار سے
تیغِ نگاہِ ناز کے مارے چلے گئے

تیرا خیال، ذکر ترا، آرزو تری
میرا نصیبِ خفتہ سنوارے چلے گئے

بھولے ہوئے تھے راستہ ہم دشتِ فکر میں
پر شکر ہے کہ تیرے دوارے چلے گئے

جب بات تیری مست نگاہوں کی آ گئی
بزمِ فلک سے صبح کے تارے چلے گئے

وہ ذرہ آفتاب نما عین ذات ہے
قادر کو ہم اللہ پکارے چلے گئے

(رحمان بابا)

باب ۳ ستارے کی تولید

آپ نے علم نجوم کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ فضائے آسمانی میں تارے کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ سائنس یہ بتاتی ہے کہ ابتدائے آفرینش میں فضا مادی ذرات سے بھری ہوئی تھی، اور ہر ذرّے کی باطنی طاقت اس کو پھیلاؤ کی طرف آمادہ کرتی تھی۔ یہ طاقت اس میں گرمی اور روشنی کی شکل میں موجود تھی۔ اور دوسری طاقت جو ذرّوں کی باہمی کشش سے ان کو آپس میں سکیڑ کر یک جا کرنے اور ٹھوس بنانے کی شکل میں نمودار ہوتی ہے موجود تھی۔

طاقتوں کا یہ تضاد مادہ کی ازلی صفت ہے اور کروڑوں سال میں ایسا ہوتا ہے کہ جب کہیں کائنات میں ان دونوں طاقتوں کا توازن میزان میں صحیح اترتا ہے تو یک لخت یہ فضائی گرد انتہائی تیزی کے ساتھ یکجا ہو کر ستارے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ تارہ اپنی گرمی کے سبب آگ بن جاتا ہے اور اس تیزی کے ساتھ چلتا ہے کہ اس کا درجۂ حرارت دنیا کی ہر آگ سے دس ہزار

گنا تیز تر ہوتا ہے۔ سورج بھی دوسرے تاروں کی طرح ایک تارا
ہے مگر چونکہ اور تارے سورج سے نسبتاً بہت فاصلہ پر ہیں
اس لئے ان کی روشنی اور گرمی ہم تک بہت ہی قلیل مقدار میں
پہنچتی ہے کل فضا میں گردہی گرد ہے۔ نہ وقت کا تعین نہ وجود
کا تعین۔ اس ماحول میں جب ایک تارا نمودار ہوتا ہے تو اس تارے
سے مکان کا تعین، زمان کا تعین اور رُخ کا بھی تعین ہو جاتا ہے
یہ فضائی گرد باطنی اور ظاہری طاقتوں کا تصادم ہے اور قرنوں
سے ہوتا چلا آیا ہے کہ وقت کی شہادت ایک تارے کی انفرادی وجود
کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یہ تارا خود بھی جلتا ہے اوروں کو بھی
جلاتا ہے۔ خود وجود پا کر عالم کو وجود میں لاتا ہے۔ خود زندہ بن کر
زندگی بخشتا ہے اور اپنی انفرادیت کو فنا کرنے کے بعد فطرت میں موت
کی شکل میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ قوموں نے اگر ہم سے پہلے تلاشِ
حق میں سورج کو معبودِ حقیقی مانا تھا تو ان کے شعور کے لحاظ سے
بیجا نہ تھا۔ مادی وجود کا برہما وشنو اور شیو یہی ہے۔

اسی طرح مادی طاقتوں کے علاوہ زندگی اور حیات کی بھی
بہت سی طاقتیں موجود ہیں۔ ایک تارے کی تخلیق کے لئے جس طرح
کئی طاقتیں آپس میں متحد ہوتی ہیں اسی طرح زمان و مکان کی کئی

طاقتیں قبلہ نما کی طرح چکر کاٹ کاٹ کر جب مرکز پر آجاتی ہیں تو ایک ایسا انسان پیدا ہوتا ہے جو لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا مصداق ہوتا ہے۔ صدہا سال کے صحیح خاندانی روابط اور پھر بدلتے رہنے والے ماحول سے ہم آہنگی کرنے والی انفرادیت کے سبب ایک ایسی صورتِ حال وجود میں آتی ہے جس میں وہ انسان خود بخود پیدا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صانعِ قدرت نے بڑی شفقت و محبّت کے ساتھ اسے اپنے ہاتھوں سے سنوارا اور ڈھالا ہے۔ گویہ واقعات ارتقائے حیات کے لازم و ملزوم جز ہیں۔ مگر ایسے شخص کی پیدائش تاریخِ انسان میں ایک سنگ میل ہوتی ہے اور اس کا وجود ایک بہت بلند منزل اور مینارِ نور ہوتا ہے۔ جس کو صدیوں تک انسان پیشِ نظر رکھ کر بڑھتا چلا جاتا ہے اس واقعہ یا سانحۂ حیات کے ساتھ اور عجیب و غریب باتیں بھی نمودار ہوں تو تعجّب کی کون سی بات ہے۔ جب قسمت اور فطرت دونوں اس وجود کے ہمراز و ہم ساز ہوں تو کائنات وجود میں اور دوسرے رنگوں میں بھی اس کا اثر کیوں نہ ہو۔

سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط کی عبرت انگیز داستان سے کون واقف نہیں اور کون نہیں جانتا کہ سلطنت کا وقار اور جلال

کس طرح تہذیب وتمدن کی نفاستوں اور رنگینیوں میں کھو گیا۔ کس طرح ایمان کی حرارت صرف اخلاقی مٹھاس بن کر رہ گئی۔ اور باطن کی عظمت صرف ظاہری وجاہت میں تبدیل ہو گئی۔
جب بھی کسی تہذیب یا تمدّن نے اپنے عروج پر پہنچ کر موت کی آخری ہچکی لی ہے تو فطرت کی بھی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ دَورِ مغلیہ کا فطرت شناس شاعر مرزا غالب فطرت کے اس غم کا ایک آنسو تھا۔
جس طرح ہر فرد کی ایک روح ہوتی ہے اور اس کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم وملّت کی بھی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں نشوونما پاتی ہے۔ اور جب اس ملّت کی موت کا وقت آجاتا ہے تو شمع کی آخری بھڑک کے ساتھ ایک بہت ہی نمایاں ہستی عالمِ وجود میں آتی ہے اور نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا نیا باب کُھلتا ہے۔
شمالی ہند میں ظفر شاہ کی زندگی کے ساتھ سلطنتِ مغلیہ کا دفتر بند ہو گیا۔ اور جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان کی شہادت سے شیرازہ بندی ٹوٹ گئی تو ایسی کیفیتیں موجود تھیں جو دلوں کو گرما رہی تھیں اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ایسے قطرے مچل رہے تھے جو ڈھلکنے کی بے حجابی گوارا نہ کر سکتے تھے چنانچہ چند قلوب جو

قدسی طاقتوں کے متحمل ہو سکتے تھے۔ فضائی کیفیت کے حامل بن گئے اور مقصدِ حیات کی تکمیل کرتے رہے۔

ترچناپلی کے نواب قادر خاں ایسے ہی بزرگوں میں تھے جنہیں ایک ڈوبتی ہوئی سلطنت اور ایک غرق ہونے والی کشتی کا آخری ملاح کہا جا سکتا ہے بظاہر ایک بادشاہ بباطن ایک فقیر جہاں موصوف کا شعورِ فروغِ اسلام اور اس کے جاہ وعظمت کی پامالی پر آنسو بہاتا تھا۔ وہیں ان کے قلب میں ٹیپو سلطان کے ایمان کی تلواریں بھی چمکتی رہتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب برطانیہ کی طرف سے باز پرس ہوئی تو نواب قادر خاں صاحبؒ کے دو صاحبزادے محمد علی خاں اور سردار خاں برما بھیج دیئے گئے۔

نواب محمد علی خاں نے اپنے لڑکے یعنی بابا قادر اولیا سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا تھا۔ تمہارا نام تمہارے دادا کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ہمارا خاندان درویشوں کا خاندان ہے، تم فقیری کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ میرے نصیب میں تو نہ تھا مگر تم ناگپور ضرور جانا۔ ہمارے خاندان میں بہت سے صاحبِ مرتبہ بزرگ گزرے ہیں۔ تمہارے تایا سردار خاں صاحب کا ویزاگ Vizag میں مزار ہے۔

ان کی کرامتوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ تمہاری دادی بی اماں بڑی بزرگ تھیں۔ اکیسویں زچگی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بطن سے پندرہ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ مگر سوائے میرے اور تمہارے چچا یوسف خاں کے جن کا خاندان بڑھ گرہ مالابار میں ہے سب کے سب لڑکے اکیس سال کی عمر ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ اور لڑکیاں سن بلوغ سے پہلے ہی فوت ہو گئیں۔ آخری لڑکی جس کی عمر تقریباً گیارہ سال کی تھی۔ اس نے کاجو کا پھل کھا لیا جس کی وجہ سے سارا گلا پھول گیا اور سانس بند ہو گئی اور وہ تیسرے دن انتقال کر گئی۔ مجھے اور تمہارے چچا کو جب میری عمر پانچ سال کی تھی گورنمنٹ نے برما پرورش کے لئے بھیج دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک نیم پخت انڈا اور دودھ پلایا جاتا تھا۔ اور کھانے کے لئے ابلا ہوا گوشت، سیاہ مرچ اور نمک ڈال کر دیا جاتا تھا۔ جب میری عمر گیارہ سال کی اور تمہارے تایا سردار خاں کی پندرہ سال کی ہوئی تو والد صاحب کو دکھانے کی غرض سے ہم دونوں کو مالابار بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک دن ہم لوگ کاویری ندی پر نہانے گئے۔ میرے عزیزوں نے گورنمنٹ کو یہ جھوٹ موٹ رپورٹ دی کہ سردار خاں نہاتے وقت بہہ گیا اور بہت واویلا کیا۔ کچھ دنوں کے بعد تمہارے

دادا نے گورنمنٹ کو یہ درخواست دی کہ میرا ایک ہی لڑکا رہ گیا ہے اس کو برما نہ بھیجا جائے۔ گورنمنٹ نے یہ درخواست منظور کر لی اور مجھ کو مع دو ملازموں کے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ ہم تینوں کے کھانے کے خرچ کے لئے اسّی ۸۰ روپے ملتے تھے اور اسکول کی فیس تئیس روپے۔ علی گڑھ میں علاوہ اور چیزوں کے عربی اور مذہبی علوم مجھے خاص طور سے سکھائے گئے۔ جب میں فارغ التحصیل ہوا تو فوج میں فرانٹیر کی آٹھویں رجمنٹ کا پیش امام بنا کر افغان وار میں بھیج دیا گیا۔ تمہارے دادا نے علاوہ بی اماں کے ایک ہندوستانی طوائف سے بھی شادی کی تھی۔ اس سے ایک لڑکی تھی جس نے ترچناپلی کے نواب کی کُل جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور میں نے قرآن شریف اٹھا کر یہ قسم کھائی تھی کہ آبائی جائداد کا ایک حبّہ بھی نہیں لونگا محنت کروں گا، بھیک مانگوں گا اور زندہ رہوں گا۔ مگر یہ روپیہ میرے لئے حرام ہے۔ عرصہ کے بعد جب میں ریٹائر ہو کر دجیانگرم میں مقیم تھا تو گورنمنٹ کی طرف سے میرا حصّہ پچاس ہزار روپے آیا۔ مگر میں نے اسے منظور نہ کیا اور گورنمنٹ نے اسے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۳۸ء میں بابا قادر اولیا کے سوتیلے خالو جو پولیس میں ملازم تھے اپنی کسی ڈیوٹی پر وجیانگرم تشریف لائے

اور بابا صاحب کی موجودہ قیام گاہ پر آکر جب بابا صاحب کو دیکھا تو ان کے جذبات میں اتنا ہیجان پیدا ہوا کہ روتے روتے بیہوش ہو گئے پھر بابا صاحب کی والدہ محترمہ سے ملاقات کر کے روئے اور کہا کہ ہمارے خاندان کا ایک فرد ایسا بھی ہے جس نے فقیری کو نوابی سے بالاتر ثابت کر دکھایا۔

بابا صاحب کی پیدائش کا حال یوں ہے کہ آپ کے والد بزرگوار نواب محمد علی خاں فوج کے جس دستے کے ساتھ تھے جب وہ دستہ منتشر کر دیا گیا اور آپ ریٹائر ہو گئے تو وجیانگرم میں قیام فرمالیا اور تا حیات مسجد کی پیش امامی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے وہاں ایک پرانے پٹھان خاندان میں شادی کر لی تھی اور بابا صاحب انہیں خاتون کے بطن سے ۳ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ کو بروز جمعرات بعد نماز فجر پیدا ہوئے۔

وجیانگرم کا وہ محلہ جس میں بابا صاحب کی ولادت ہوئی اپنی غریبی، شرافت اور اخلاص کی ایک تصویر ہے۔ مگر اہل محلہ کے دلوں کو دیکھئے تو ان میں مہمان نوازی، خلوص اور بے پناہ عقیدت موجود ہے۔ جو بڑی مہذب سوسائیٹوں اور بڑے شہروں کے بڑے بڑے محلوں میں ناپید ہے۔ محلہ کے زیادہ تر مکان کچے ہیں۔

مگر جس مکان میں بابا صاحب پیدا ہوئے وہ چھوٹا سا پختہ مکان ہے جو اب بھی موجود ہے۔ بابا صاحب کے بعد پانچ لڑکیاں ہوئیں، جو شوہروں کے ساتھ وجیانگرم میں مقیم ہیں۔ بابا صاحب کے والد صاحب قبلہؒ کی آخری اولاد سردار خاں تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی مگر اکیس سال کی عمر میں چیچک کے عارضے سے انتقال فرما گئے۔ ان کی اہلیہ بقید حیات ہیں۔

وجیانگرم ایک عجیب شہر ہے۔ جو بہت سے قدیم رجواڑوں کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ ایک طرف اگر ان راجاؤں کے محلات، قلعے اور شکارگاہیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں تو دوسری طرف عاشقانِ دین اور بڑی بڑی بزرگ ہستیوں کے مزارات بھی پائے جاتے ہیں۔ وجیانگرم کے زیادہ تر راجگان ان فقراء کے معتقد رہے ہیں اور مشکل وقتوں میں ان سے امداد طلب کی ہے۔

ان بزرگوں کے بہت سے واقعات اور کرامتیں وہاں کے عوام میں اب تک مشہور ہیں ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد وجیانگرم کی راجدھانی بھی ختم ہو گئی اور تمام محلات میوزیم اور اسکول بنا دیئے گئے۔ وجیانگرم کے راجاؤں کے فراز اور پستی کی کہانی کے ساتھ ساتھ پچھلی پانچ چھ صدیوں میں مست فقیروں اور کسی نہ کسی مردِ مومن کا

وہاں آنا اور اس دنیاوی شان و شوکت اور نظم و ضبط کے ماحول میں مرکزِ حق بنا کر حق کا بول بالا کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔

جب قدیم شہروں میں مادی تہذیب و تمدّن کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسانی آبادی اُجڑ جاتی ہے تو دوسری مخلوق جیسے جنّات اور ارواحِ خبیثہ وہاں اپنی سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ ایک راز ہے جسے اللہ ہی جانتا ہے یا اس کے حبیب کو معلوم ہے۔ وجیانگرم میں بھی جنات اور ارواحِ خبیثہ کے ایسے ایسے واقعات گذرتے رہے جن کے آگے بڑے بڑے سائنسدانوں کے سر جھک جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں بھی قائل ہو جاتی ہیں۔

فقراء کا کام بظاہر انسانیت کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر ان کا دائرۂ عمل محدود نہیں ہے۔ جس محلّہ میں بابا صاحب قبلہ کی ولادت ہوئی ہے۔ اس محلّہ سے کچھ آگے ایک تالاب ہے جو کالے تالاب کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے کنارے ہندوؤں کے مُردے جلائے جاتے ہیں۔ آج سے دس سال پہلے کی بات ہے کہ شیر کا سا دل رکھنے والے انسان بھی دن دھاڑے اگر ادھر سے گذر جاتے تھے تو ان پر وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور آئے دن کوئی نہ کوئی حیرت انگیز واقعہ پیش آتا رہتا تھا ہمارے شہر میں

تاجروں کے علاوہ جتنے بھی مسلمان ہیں انتہائی غریب اور ناخواندہ ہیں۔ جب کسی سوسائٹی پر غربت چھا جاتی ہے تو بہت سی برائیاں بھی اس کے ساتھ ساتھ آجاتی ہیں۔ غربت خود سب سے بڑا گناہ ہے۔ مسلمان عوام کی حالت ہر جگہ اور ہر ملک میں اس کی شہادت دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ تقریباً ہر ملک میں فرد یا خاندان یا جماعت کے آگے نہ تو کوئی نصب العین ہے نہ کوئی ولولہ، نہ کوئی امید۔ پھر جوشِ عمل ہو تو کس برتے پر۔ اپنی غربت پر ہی راضی ہو کر مسلمان اپنا وقت یا تو ایک دوسرے کی برائی اور خانہ جنگیوں میں صرف کرتے ہیں یا کہیں کہیں مذہب کا خول ڈال کر ظاہر داری اور فرقہ بندی کی جنگ میں مبتلا رہتے ہیں۔

غرض ایسے ہی ماحول میں بابا صاحب کی پرورش ہوئی۔ آپ کا ظہور عین منشائے قدرت تھا اس لئے کہ روحِ انسانی کے اردگرد جب تاریکی کا انتہائی غلبہ ہوتا ہے تو فطرت اسی تاریکی میں سے ایک چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ صدیوں کی تہذیب جب زیرِ زمین پہنچ کر کھاد بن جاتی ہے تو اس کھاد میں سے ایک گلاب پیدا ہوتا ہے۔ جس کی روح پرور خوشبو دور دور تک پھیل جاتی ہے۔

بابا صاحب کے والد محترم ہر چند کہ مسجد میں پیش امام تھے

اور اکثر سجدے میں مگر دل ہی دل میں قوم کی بدحالی اور تباہی پر آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اور اکثر سجدے میں اپنے کریم سے گڑگڑا کر یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ "اے رب العزت مسلمانوں کے گناہوں کو بخشدے ان پر رحم کر اور ان میں ایک دفعہ پھر وہی زندگی اور ایمان کی تازگی پیدا کر جس کی روشنی نے ساری دنیا کی تاریکی کو ختم کر دیا تھا" آخر اُن کے دل کی تڑپ کام آئی اور ان کی دعائیں مقبول ہوئیں اور زمانہ کی پستی اور انحطاط میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے بابا صاحب نے جنم لیا۔

بابا صاحب کی پیدائش کے بعد آپ کی والدہ محترمہ کے سینہ میں زخم پڑ گئے۔ اور وہ دودھ پلانے سے معذور ہو گئیں تو ایک غریب لکھی عورت مسمّاۃ اچمّا جو وہیں کے ایک قریبی گاؤں کنمپکا میں رہتی تھی دودھ پلانے پر مقرّر کی گئی۔ وہ روزانہ علی الصبح آکر رات کو دیر تک رہتی اور تمام دن خدمت کے بعد اپنے گھر جاتی۔ بابا صاحب سے اس کو بے انتہا محبّت تھی۔ کبھی کبھی وہ بابا صاحب کو اپنے گھر بھی لے جاتی اور ان کو ایک جھولے میں لٹا کر خود گھاس کھودنے کے لئے گاؤں سے باہر چلی جاتی۔

ایک دفعہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اتفاق سے گاؤں میں آگ

لگ گئی۔ آگ کے شعلے دیکھ کر اچھّما اپنے مکان کی طرف دوڑی۔
گرمیوں میں تاڑپان کے مکانوں کے جلنے کا منظر جن لوگوں نے
دیکھا ہے ان کو اندازہ ہے کہ کیا قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ اِدھر
تو آگ بھڑک رہی تھی اُدھر اچھّما کے دل میں اس سے بھی تیز
قیامت برپا تھی۔ وہ چیخ رہی تھی کہ ہائے میرا بچّہ جل گیا ہوگا۔
ہر چند کہ وہ جاہل عورت تھی۔ مگر اس کو ذمہ داری کا بے حد
احساس تھا۔ چیختی تھی اور کپڑے پھاڑ پھاڑ کر دھاڑیں مارتی
تھی کہ ہائے میرے بچّے کو بچالو۔ مگر کس کی مجال تھی جو بھڑکتے
ہوئے شعلوں کے قریب جاتا۔ آگ بڑھتی گئی مگر جس جھونپڑے
میں بابا صاحب اپنی طفلی کی نیند سو رہے تھے وہاں آگ پہنچنے
تک ہوا کا رُخ یکدم بدل گیا اور آگ بجھ گئی۔ اچھّما دوڑ کر اندر
گئی اور بابا صاحب کو اٹھا کر کلیجہ سے لگایا۔ سارے گاؤں میں
اس بات کی خبر پھیل گئی اور گاؤں والوں نے ایک زبان ہو کر
کہا کہ یہ بچّہ کوئی معمولی بچّہ نہیں ہے۔ یہ کوئی مہاتما ہے۔

ایسے واقعات اکثر بزرگوں کے متعلق سننے میں آئے ہیں،
جو بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں مگر غور کیجیے تو یہ کوئی عجیب بات
نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی ہستیوں کو وجود میں لانے کے لئے جب

فطرت صدیوں سے انتظامات کرتی ہے تو ایسے واقعات کیوں خلاف قانونِ قدرت معلوم ہوں۔ جن کی آنکھیں عالمِ مثال کے پس پردہ دیکھتی ہیں انہیں ان واقعات کے پیچھے صانعِ قدرت کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

اچّما نے بابا صاحب کو تقریباً پانچ سال کی عمر تک اپنے سے جدا نہیں کیا۔ جب آپ کی عمر پانچ سال سے کچھ تجاوز کر گئی تو آپ کے والدین اپنے اعزاء سے ملانے کے لئے مالابار لے گئے۔ اور وہاں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد پھر وجیانگرم واپس آگئے۔

ایک دن بابا صاحب کو نہایت عمدہ لباس جس میں کچھ کچھ نوابی شان تھی پہنا کر آپ کے والد محترم بازار میں لے جا رہے تھے۔ اس دن بابا صاحب میں ایک عجیب سادگی، عجیب حسن اور عجیب کشش پائی جاتی تھی۔ اچّما نے انہیں دور سے دیکھا اور "میرا بچہ میرا بچہ" کہتی ہوئی دوڑی آئی اور بابا صاحب سے لپٹ گئی اور بیہوش ہو کر گر پڑی معلوم نہیں اس پر بابا صاحب کو گلے لگانے میں کیا گذری۔ مگر اس کے بعد وہ پھر ہوش میں نہ آئی دو روز تک "میرا بچہ میرا بچہ" کہہ کر چیختی رہی اور دو دن کے بعد اپنے گاؤں میں جان بحق ہو گئی۔ بابا صاحب کے والد محترم نے جب یہ خبر سُنی تو اس کے گاؤں گئے اور کفن و دفن کا انتظام کیا۔ اِس واقعہ کے

بعد کئی دن تک بابا صاحب جن کی عمر اس وقت نو یا دس برس کی تھی بالکل خاموش اور عالمِ محویت میں رہے۔

تعلیم عمر کا صحیح اندازہ نہیں مگر پہلے پہل آپ کو راجہ بازار کے ایک تلگو اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں آپ نے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کا داخلہ میونسپل اسکول میں کر دیا گیا۔ آپ کے ایک استاد جواب بہت زیادہ ضعیف ہو گئے ہیں، بقیدِ حیات ہیں اور آج کل سارا وقت بابا صاحب کی خدمت میں گزارتے ہیں بیان کرتے ہیں کہ "بابا صاحب کو پڑھائی سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ صرف رامائن اور بھگوت گیتا اور اسی قسم کی مذہبی کتابیں اور اگلے زمانہ کے بزرگوں کے قصّوں کو نہایت غور سے سُنا کرتے تھے اور جب آپ کے والد بزرگوار پیغمبروں اور اولیا اللہ کے واقعات بیان کرتے تھے تو بڑے انہماک سے سُنتے۔"

ایک دن کا واقعہ ہے جب آپ شاید پانچویں جماعت میں تھے تو ایک ماسٹر نے اس غلطی پر کہ سبق یاد کر کے نہیں آئے تھے آپ کو خوب پیٹا یہاں تک کہ آپ کے بدن پر داغ پڑ گئے۔ آپ سہمے ہوئے اور تمتماتے ہوئے جب گھر پہنچے تو آپ کے والد صاحب کو بہت غصّہ آیا۔ اور اس دن سے آپ کی تعلیم ختم کر دی گئی۔ ادھر

ماسٹر صاحب جب گھر پہنچے تو انہیں تیز بخار چڑھا اور ان کے سارے بدن پر نیلے نیلے آبلے اُبھر آئے اور دوسرے ہی دن انتقال کر گئے۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ استاد کی نیت نیک تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں بچوّں کو مار کر تعلیم دینے کا عام رواج تھا۔ استاد چاہتا تھا کہ بچہّ پڑھ لکھ کر کام کا ہو جائے۔ پھر بھی اسے سزا ملی۔

اس کو یوں سمجھئے جیسے کہ نماز کی نیتّ سے جا رہے ہوں اور راستہ میں تاریکی ہو اور کنواں بھی ہو۔ تو آپ کا کنوئیں میں گرنا لازمی ہے۔ اس قسم کے قصور کو قدرت لاعلمی کی بنا پر معاف نہیں کرتی۔ بچہ اگر آگ کو کھانے کی چیز سمجھ کر پکڑ لیتا ہے تو اس کی معصومیت کام نہیں آتی بلکہ فطرت اس کا ہاتھ جلا دیتی ہے۔ اسی طرح جب منشائے فطرت اور قوم کی امید کے مجسمہّ کو کوئی اذیت پہنچتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت خود اس کا انتقام لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب ایک مجسمہ اپنے روحانی شعور پر پہنچے اور صبر کا جامہ زیب تن کرلے تو اپنی مرضی سے فطرت کی آگ کو خود جذب کرلے یا مخلوق کے لئے باوجود ان کے دانستہ یا نادانستہ ظلم ڈھانے کے رحمت بن جائے۔

اسکول چھوڑنے کے بعد باباصاحب بکریوں اور خرگوشوں سے جو گھر میں پلے ہوئے تھے کھیلا کرتے تھے۔ لیکن آپ زیادہ تر خاموش اور اکثر کسی خیال میں غرق رہا کرتے تھے۔ شام کے وقت جب محلّہ کے لڑکے اور لڑکیاں انہیں کھیلنے کے لئے بلانے آتے تو ان کو بالکل غرق پاتے تھے۔ یہانتک کہ انہیں ہلا ہلا کر جگانا پڑتا تھا۔ وہ کون سی فکر تھی، وہ کون سی سوچ تھی۔ وہ کونسا غم تھا، جس میں آپ غرق اور غلطاں رہتے تھے؟ کیا رازِ حیات کے افشا کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے؟ یا یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

بچوّں کے کھیلوں میں تو آپ دلچسپی نہ لیتے تھے مگر ہندوؤں یا مسلمانوں کے مذہبی قصّوں اور میلاد، کتھا جیسے مذہبی جلسوں میں آپ بہت شوق کے ساتھ حصّہ لیا کرتے تھے اور وہاں ایسا محسوس کرتے تھے کہ سب کچھ اپنے ہی مشرب کی باتیں ہو رہی ہیں۔

آپ تنہائی میں ہر مذہب کے بزرگوں سے ایک قسم کی یگانگت، محبّت اور کشش محسوس کرتے اور یہ سوچتے رہتے کہ آخر ان لوگوں میں ایسی کیا بات تھی اور وہ ایسے کون سے بھید پا گئے تھے کہ مرنے کے صدہا سال بعد بھی ان کے ذکر میں جو زندگی ہے، وہ زندہ

انسانوں کے وجود میں نہیں ہے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ دنیا کیا ہے زندگی کے جھگڑے کیوں ہیں، خوشی اتنی کیوں کمیاب ہے، غم اسقدر کیوں محیط ہے، اور سکون و قرار کیوں ناپید ہے، دل اِس قدر کیوں بیقرار ہے، کس چیز کے لیئے بیچین ہے۔ کیا ڈھونڈ رہا ہے، اور اس کو کیا کرنا ہے۔

آپ کے والد محترم کو آپ سے انتہائی محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ آپ کی والدہ محترمہ، اللہ انہیں بخشے آپ پر بہت سختی کرتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ آپ نہایت ہی ضدی اور ہٹی تھے جو بات دماغ میں سما جاتی تھی چاہے وہ اُلٹی ہو یا سیدھی پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ کھانے کے وقت جب سارے گھر کے لوگ دستر خوان پر جمع ہوتے اور آپ کو کوئی بات ناگوار ہوتی تو کھاتے پر لات مار کر فوراً ہی کھڑے ہو جاتے۔ ان کی کسی ایسی حرکت پر ان کی والدہ انہیں کھینچ کر باہر لے جاتی تھیں اور اس قدر پیٹتی تھیں کہ جسم پر مار کے نشان اُبھر آتے تھے، یا کبھی کبھی چمٹا گرم کر کے داغ بھی دیا کرتی تھیں۔ مگر یہ تمام سزائیں بے اثر ثابت ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ جب ان اذیتوں کی تکلیف دب جاتی تھی تو بابا صاحب سب کچھ بھول

جاتے تھے۔ اور پھر سے اپنی روش پر آجاتے تھے۔
آپ کے والد محترم جب ان سختیوں کو دیکھتے تو بہت متاثر ہوتے۔ اپنی اہلیہ سے تو کچھ نہ کہتے مگر بابا صاحب کو گلے سے لگا لیتے، پیار کرتے اور ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتے۔ آپ کے والد صاحب میں باپ کی شفقت ہی نہیں بلکہ ماں کی مامتا بھی موجود تھی اور وہ جب بابا صاحب کی طرف دیکھتے تو ان کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بہت دور کی کوئی خاص چیز دیکھ رہے ہیں۔
ان کو نامعلوم طور پر اس کا احساس تھا کہ یہ الھڑ بچہ مافوق الفطرت ہے۔ اس کی ظاہری حرکات قابلِ غور نہیں۔ آپ اکثر بابا صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نماز پڑھتے اور عمدہ قرأت کے ساتھ تلاوتِ قرآن فرماتے۔ اس وقت بابا صاحب نہایت ادب و احترام سے دوزانو بیٹھ کر سنا کرتے۔ بابا صاحب کو اپنے والد سے بے حد محبت تھی۔ اگرچہ آپ کو ظاہری طور پر ان کی اطاعت مدنظر تھی۔ مگر دل اظہارِ محبت سے شرماتا تھا۔
شام کے وقت بابا صاحب اکثر اپنے ساتھیوں کو لے کر کالے تالاب کی طرف ٹہلنے کے لئے نکل جاتے۔ حالانکہ بچپن کی ہر بات آپ میں موجود تھی اور نوعمروں کے ہر کھیل اور شرارت میں

انہماک کا اظہار کرتے مگر پھر بھی آپ ساتھیوں سے زیادہ بات چیت نہ کرتے تھے۔ بابا صاحب کے بچپن کے کئی دوست ابھی تک موجود ہیں۔ خاص کر رحمٰن خان صاحب جن کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ (انہوں نے قادر نگر۔ وزیا نگرم میں قیام کر لیا ہے) ان لوگوں کا کہنا ہے کہ بابا صاحب بچپن ہی سے یہ نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا چیز ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جھوٹ بولنے کی صلاحیت ہی آپ میں نہ تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ میں سیدھا پن تو اتنا تھا کہ کوئی بھی کچھ پوچھتا تو سادگی کے ساتھ جو بھی بات صحیح ہوتی بتا دیتے۔ بچپن کے دوستوں میں سے کوئی اگر زور سے قہقہہ لگاتا تو بابا صاحب ایک طرف ہٹ کر ایک قسم کی فکر میں غرق ہو جاتے۔ اکثر دیکھا گیا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اور جیسے ہی کوئی ساتھی کسی کھیل میں مشغول ہوا تو الگ ہو گئے اور گھنٹوں ساکت کھڑے رہے۔

آپ کو کھیل کود سے زیادہ شوق نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی کبڈی یا گلی ڈنڈا ضرور کھیل لیا کرتے تھے۔ آپ کا مرغوب مشغلہ یہ تھا کہ دو ایک ساتھیوں کو لے کر بہت دُور ٹہلنے نکل جاتے۔ یا پھر گھوڑے کی سواری کیا کرتے۔ ایسا ہوتا تھا کہ جب راجہ کے سائیس گھوڑوں کو ٹہلانے کے لیئے جایا کرتے تو کبھی کبھی آپ کے

گھر کے پاس بھی گھوڑا لے کر آتے اور آپ کو سواری کراتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک انسپکٹر کے گھوڑے پر سوار ہو کر کالے تالاب کی طرف نکل گئے۔ گھوڑا تھا تو سیدھا مگر اس دن بڑی تیزی سے گیلپ کرتا ہوا تالاب کی سڑک سے بہت دور نکل گیا اور ایک بڑے برگد کے درخت کے پاس چٹانوں میں کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک اُٹھا۔ بابا صاحب اس پر سے گر کر بیہوش ہو گئے۔ جب گھوڑا بغیر سوار کے گھر پہنچا تو لوگوں کو تشویش ہوئی اور وہ کمیل روڈ پر گئے اور بابا صاحب کو چٹانوں کے قریب زخمی پایا گیا۔ راہ گیر آپ کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہ مقام اس زمانہ میں ایسا وحشت ناک سمجھا جاتا تھا کہ نہ صرف جنگلی درندوں اور سانپ بچھوؤں کے ڈر کے مارے بلکہ جنوں اور ارواحِ خبیثہ کے خوف سے بھی دن کے وقت کوئی تنہا نہ گذرتا تھا۔

یہ وہی مقام ہے جہاں کے لئے کئی سال بعد بابا تاج الدین اولیاؒ کا اشارہ بابا صاحب کے لئے ہوا تھا کہ تمہیں اس جگہ قیام کرنا ہے اور یہیں حق کا جھنڈا گاڑنا ہے۔

جوں جوں بابا صاحب کی عمر بڑھتی گئی آپ تنہائی کو زیادہ پسند کرنے لگے اور اکیلے کمبل روڈ پر جانے لگے۔ وہاں جا کر یہ

حالت ہونے لگی کہ گھر آتے تو نہ کھانے کا خیال ہوتا اور نہ ہی سونے کا۔ کبھی کبھی جب بہت تھک کر واپس آتے تو جوتا اتارے بغیر ہی لیٹ جاتے اور آپ کے والد صاحب نہایت شفقت سے آپ کے کپڑے اتارتے اور کچھ نہ کچھ کھلا دیتے۔ کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ تنہائی پسندی، یہ استغراق اور یہ انوکھے انداز بے معنی نہیں ہیں۔

بچپن میں بابا صاحب کی طبیعت میں بے انتہا ڈر تھا۔ آپ تاریکی سے بہت ڈرتے تھے اور اندھیرا ہونے کے بعد پیشاب تک کے لئے اپنے والد صاحب کو ساتھ لے جاتے اور جب تک پیشاب کرتے رہتے ان کا ہاتھ پکڑے رہتے۔ کسی نئی جگہ یا اجنبی لوگوں میں بھی جانے سے آپ بہت گھبراتے تھے۔ رات کے وقت اگر کوئی گیدڑ (کولا) بھی بولتا تھا تو ڈر سے پیشاب خطا ہو جاتا تھا۔ آپ کی والدہ آپ کو اکثر یہ کہہ کر ڈرایا کرتی تھیں کہ بیراگی گھومتے پھرتے ہیں وہ بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور ان کو کڑاہی میں ابال کر ان سے مومیائی بناتے ہیں۔ اس لئے آپ جہاں کسی بیراگی کو دور سے بھی دیکھ لیتے تو راستہ کترا کر گھر کیطرف بے تحاشا بھاگے چلے جاتے۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ ابھی عمر دس بارہ سال کی ہو گی۔
چہار شنبہ کی شب صبح کے چار بجے کا وقت تھا کہ آپ نے بشارت
میں دیکھا کہ آپ کے مکان کے بالکل مقابل جو ایک بزرگ سیلان
شاہ صاحب کا مزار ہے اور جس پر آپ اکثر جوتوں سمیت کودتے
پھاندتے تھے، اس مزار سے بزرگ نکلے ہیں اور سبز لباس پہنے
آپ کے دروازہ سے باہر کھڑے ہوئے ہیں اور جیسے ہی بابا صاحب
دروازہ سے باہر نکلے تو ان بزرگ کو بابا صاحب نے کوئی فقیر سمجھا
اور ڈر کر گھر کے اندر لوٹنا ہی چاہتے تھے کہ سیلان شاہ صاحب نے
آواز دے کر کہا کہ ڈرو مت، اِدھر آؤ۔ جب آپ قریب گئے تو
ہاتھ پکڑ کر شاہ صاحب اسی مزار کی طرف لے گئے اور جیسے ہی
یہ دونوں قریب پہنچے، تو مزار شق ہوا اور نیچے کی طرف اترتی ہوئی
سیڑھیاں نظر آئیں۔ دونوں سیڑھیوں سے اندر اُترے۔ یہاں ایک
بان کی چارپائی تھی جس پر چادر بچھی ہوئی تھی۔ سیلان شاہ صاحب
نے حضور کو چارپائی پر بٹھلایا اور خود پائینتی بیٹھ گئے اور کہنے لگے
کہ آپ ہماری قبر پر جوتوں سمیت کودتے پھاندتے پھرتے ہیں۔ آپ
بہت بڑے ہیں۔ سارے دفتر آپ کے ہاتھ میں ہیں وغیرہ وغیرہ۔
حضور نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاہ صاحب نے کوئی چیز پلنگ کے نیچے

سے اٹھا کر آپ کے ہاتھ میں دی۔ آپ نے اسے کھایا نہیں مگر مٹھی میں بند کر کے رکھ لیا۔ اس کے بعد دونوں سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر آ گئے۔ اور قبر جو شق تھی بند ہو گئی۔ شاہ صاحب آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے دروازہ تک پہنچا کر واپس چلے گئے۔ آپ نے سارا حال اپنے والد صاحب کو جنہیں آپ بادشاہ کہا کرتے تھے سُنا دیا۔ اتنے میں آنکھ یکدم کُھل گئی اور پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی چونکہ اکیلے بہت ڈرتے تھے، والد صاحب کو اٹھا کر باہر تشریف لے گئے اور واپسی پر یہ کہا کہ خواب میں تو سنا چکا ہوں مگر ظاہر میں بھی سُن لیجیے۔ اور ساری بشارت سُنائی۔ آپ کے والد صاحب بہت خوش ہوئے اور اسی روز جمعرات کے دن اُس مزار پر پھول چڑھائے اور شیرینی پر فاتحہ دی اور رات کو خوب چراغاں کیا۔

ایسی کئی اور بشارتیں بچپن میں آپ کو ہوتی رہیں اور آپ برابر والد صاحب کو سُناتے رہے۔ آپ کے والد ان چیزوں کو خوب سمجھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ آپ سے محبت اور پیار کرتے تھے بلکہ اپنا بیٹا ہوتے ہوئے بھی احترام اور عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حال یہ تھا کہ آپ کو چارپائی پر سُلاتے تھے اور خود بازو میں فرش پر سو جاتے۔

اکثر شام کے وقت محلہ کی بڑی بوڑھیاں جمع ہو جاتی تھیں اور آپ کو بٹھا کر خدا جانے کیا اوٹ پٹانگ کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ان بوڑھیوں کے لئے بابا صاحب اپنی جیب خرچ سے افیون اور چُھٹے خرید کر لاتے تھے اور ان کو دیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بڑی بی ابھی تک زندہ ہیں جن کا ماہانہ مقرر ہے اور وہ بابا صاحب کے دربار سے ہر ماہ لے لیا کرتی ہیں۔

۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے کہ بابا صاحب اپنے حجرۂ مبارک میں قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے اور ایک خادم ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ بابا صاحب کی آنکھیں پُرنم تھیں اور سر اوُپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ اور نظر ایسی تھی کہ جیسے کوئی دُور کی چیز دیکھ رہے ہوں۔ اس کیفیت میں بابا صاحب نے بچپن کو یاد کر کے فرمایا "آہ بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ کیسی آزادی تھی۔ نہ کسی چیز کا ہوش تھا، نہ کسی چیز کا خیال۔ طبیعت میں شرارت اور ضد اس قدر تھی کہ جس کام کو بھی منع کیا جاتا تھا اسے اور زیادہ انہماک اور جوش سے کرتا تھا۔ اگر کہا جاتا تھا کہ درختوں پر مت چڑھو تو گرتا بھی تھا اور چوٹ بھی کھاتا تھا مگر خوب درختوں پر چڑھ کر کودتا پھاندتا۔ ساتھیوں کے ساتھ کھیل، سیر اور تفریح۔ اللہ اللہ کیا خواب تھا۔

بزرگوں کی کہانیوں میں استغراقِ کسی نہ معلوم شے کی نامعلوم تلاش۔ ہنسی خوشی جانوروں کے ساتھ کھیلنا۔ بڑے بڑے درختوں میں جھولے ڈال کر جھولنا۔ بڑی بوڑھیوں کی بے معنی کہانیاں۔ والد صاحب قبلہ کا پیار اور ان کی محبّت۔ لیکن اب میں کہاں ہوں۔ کیوں ہوں۔ کیا کر رہا ہوں۔ اور کہاں جانا ہے۔ کیا یہ بچپن پھر بھی آسکتا ہے ؟

ہمیں کچھ اور ہی قادر کے پردے میں نظر آیا
جمالِ من رآنی اور جلووں میں نکھر آیا

یہی وحدت کا عرفاں ہے یہی رحمت کا ساماں ہے
کہ سوزِ لا اِلٰہ میں سازِ الا اللہ اُبھر آیا

جنوں کی وادیوں کو کاٹ کر معراج تک پہنچا
کہاں جا کر ہمارے پاس عشقِ باخبر آیا

ہزاروں سال موجِ نورِ حب ساحل سے ٹکرائی
بڑی مشکل سے اس کی تہ میں اک چیدہ گہر آیا

جلائی سورۂ اخلاص نے قندیل قادر کی
تو پھر اس قاف کے اندر خدا خود جلوہ گر آیا

فنا فی الذات ہونا بحر میں قطرے کا گم ہونا
خوشا جوشِ طلب دریائے حق قطرے میں در آیا

کلیم اللہ کو بھی جستجو ہے جس تجلّی کی
یہیں پر وادیٔ سینا سے اُڑ کر وہ شرر آیا

یہ درگاہِ محبّت ہے یہ دل والوں کی بستی ہے
ردائے نور میں یاں صاحبِ شق القمر آیا

مجسم عشق بن جانا سراپا حُسن ہو جانا
اُنھی سے یہ ہُنر آیا اُنھی کو یہ ہُنر آیا

طریقت میں شریعت میں کچھ ایسے راز ہیں پنہاں
کہ جن کو کھولنے کے واسطے یہ دیدہ ور آیا

حکیمِ علمِ سُبحانی ، امینِ رازِ یزدانی
دلِ عُشّاق پر یہ بن کے قرآں سر بسر آیا

(رحمان بابا)

باب ۴ جوانی

بچپن تو کھیل کود میں کاٹا۔ لیکن جب عمر اٹھارہ یا اُنیس سال کی ہوئی اور جوانی کی منزل میں قدم رکھا تب بھی بابا صاحب اِس بات سے بالکل بے خبر رہے کہ دنیا کیا چیز ہے۔ مکر و فریب، تصنّع اور ظاہر داری اور اس قسم کی دوسری باتوں سے انہیں انتہائی نفرت تھی۔ جب کبھی ایسی باتیں پیش آتیں تو آپ بےحد خفا ہوتے اور دیر تک متاثر رہتے۔ معلوم نہیں اللہ نے آپ کو کیا بنایا تھا۔ جہاں تک جنسی تعلقات کا معاملہ ہے آپ کو ماں اور بہن کے سوا کسی بات کا علم ہی نہ تھا نہ احساس۔ آپ کے ذوق کی بلندی، حُسن کی کشش کے دائرہ سے نکل کر فطرت کے دلکش نظاروں میں پھیل گئی تھی۔ درختوں میں، پھولوں میں، ٹھنڈی ہواؤں میں، طلوعِ آفتاب کے نازک حُسن میں اور غروبِ آفتاب کی مغموم فضا میں آپ کا دل اتنا ہی گرماتا تھا جیسے کسی دنیادار نوجوان کا دل پہلی نظر میں کسی حسینہ کو دیکھ کر گرماتا ہے۔

ہر چیز میں چاہے کوئی چڑیا ہو، جنگلی پودا ہو یا جنگلی درخت

بابا صاحب وہی انفرادیت محسوس کرتے تھے جو کوئی ذی شعور اپنے دوست کے سامنے بیٹھ کر محسوس کرتا ہے۔ رات کی خموشی میں وہ محسوس کرتے کہ جگمگاتے تارے ان سے بات چیت کر رہے ہیں۔ چاندنی راتوں میں کبھی وہ چاند کی طرف دیکھتے اور کبھی چاندنی میں فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی سخت کوشیاں سو رہی ہیں اور ایک سکوت اور ایک خمار کا عالم پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔

کچھ ہوش اور کچھ بیہوشی کے درمیان انہیں ایسا عالم نظر آتا جو موت و حیات کے مابین ایک برزخ ہوتا ہے۔ چاند کو وہ اپنے سے زیادہ دور نہیں سمجھتے تھے، اور ایسا محسوس کرتے تھے کہ اسے ذرا سی جنبش دینے پر وہ آغوش میں آسکتا ہے۔ دن کی تیز دھوپ میں جب سورج نصف النہار پر ہوتا اور حرارت سے جنگل میں سکوت طاری ہوتا تو بابا صاحب کو ایسا معلوم ہوتا کہ سورج کے جلال سے ہر چیز سہمی ہوئی ہے۔

ان کے دل میں مختلف خیالوں کے طوفان اٹھتے۔ کبھی وہ دن اور رات، خلوت و جلوت پر غور کرتے اور کبھی سوچتے کہ یہ تمام جد وجہد کیا چیز ہے اور کیوں ہے۔ میں کون ہوں اور اس

دنیا میں کیوں آیا۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ دل میں ہوک سی کیا اُٹھتی ہے میں کس چیز کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ چیز مجھے کہاں سے ملے گی۔ ان کے اندر فطرت سے ہم آہنگی اور یگانگت کا احساس بھی پیدا ہوتا تھا۔ زندگی کی تڑپ اور نمود کا جوش بھی ساحل ڈھونڈتا تھا اور روح کی وہ کیفیتیں جو شعور میں بھی نہیں آسکتیں عجیب عجیب عالم دکھاتی رہتی ہیں۔

جب کوئی شخص لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی عجیب عجیب طاقتیں جاگ جاتی ہیں۔ کل تک جو پھول صرف ایک خوشبودار پھول تھا حسین بھی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور وہ نغمہ جو صرف دل کو بھاتا تھا اب دل کو کھینچنے بھی لگتا ہے۔ بچپن کے کھیل کود کا شوق اور دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کا ذوق پھیکا پڑ جاتا ہے اور طبیعت میں کچھ بیقراری سی رہنے لگتی ہے مگر کس چیز کے لئے۔ یہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور قلب میں گرمی آجاتی ہے اور اس کی حرکات و سکنات ایک رُخ کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ اور بالآخر وہ ایک ساتھی حاصل کر لیتا ہے جس سے نسبی سلسلہ چلتا ہے۔

مگر ان خاص ہستیوں کو جن کے ذریعہ مشیت کچھ اور کام لینا

چاہتی ہے اس دنیوی زندگی کے بھنور میں نہیں ڈالا جاتا کیونکہ اس طرح نہ تو ان کو سکون نصیب ہوگا اور نہ ہی وہ اس اعلیٰ مقصد سے ہم کنار ہو سکیں گے جس کے لئے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ قدرت جن کو حسنِ مجرّد سے بالمشافہ معانقہ کرانا چاہتی ہے۔ ان کو باطنی اور شعوری طہارت کے ذریعہ قدسی جامہ پہنانے کے لئے تیار کرتی ہے اور ان کی مادی اور جسمانی طاقتیں لطیف ترین کر آنکھوں کی روشنی، ذہن کی رسائی، علم کا ظرف اور قلب کی وسعت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

یہی کچھ بابا صاحب کے بچپن سے جوانی تک ہوتا رہا۔ بابا صاحب کی عمر ابھی اٹھارہ انیس سال سے آگے نہیں بڑھی تھی کہ آپ کے والد صاحب نے سوچا کہ ان کو کسی نہ کسی کام میں لگانا چاہیئے۔ جو ہونا ہے سو ہوتا رہے گا۔ دنیا کے کاموں میں ہاتھ پاؤں مشغول رہیں تو ہرج نہیں۔ اس لئے آپ کو جان حسین کمپنی وجے نگرم برانچ میں تجارت کے ڈھنگ سیکھنے کی غرض سے ملازم کرا دیا گیا۔ ایک مہینہ تک اس دفتر میں کام کرنے کے بعد بابا صاحب کا تبادلہ پرلا کمڑی کا ہو گیا۔

اس وقت پرلا کمڑی میں ہیضے کا اتنا زور تھا کہ وہاں جانے

کے لئے کوئی راضی نہ تھا۔ کاروبار سرد پڑ گیا تھا۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم تھا۔ بابا صاحب دوکان کے دروازے پر رہتے تھے اور دیکھتے رہتے تھے کہ صبح سے شام تک سو ڈیڑھ سو نعش سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ مگر اب بڑے ہو کر آپ کو ڈر تو کجا یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ میں مر جاؤں گا۔ اور یہ خیال آتا بھی تو کیسے آتا جبکہ آپ کی زندگی کی آگ کوہ آتش فشاں کی طرح سینہ میں دبی ہوئی تھی۔

اس وبا کے زمانے میں آپ کو صرف اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ کیونکہ دکان میں نمک کے بہت سے بورے رکھے ہوئے تھے، جن کو منافع پر نکالنا تھا۔ مگر برسات ہونے کی وجہ سے تقریباً سارا نمک پگھل کر بہہ گیا۔ اور کمپنی کو بہت نقصان ہوا۔ کمپنی نے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ آپ نے اس کا تو کچھ جواب نہ دیا مگر کمپنی کو مشورہ دیا کہ وہ اس موسم کی پیداوار خرید لے اور شہروں میں فروخت کرائے۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کرنے سے کمپنی کا نہ صرف سارا نقصان پورا ہو گیا بلکہ کافی بچ بھی گیا۔ کمپنی نے خوش ہو کر آپ کو ترقی دی، اور ستّر روپیہ ماہوار پر آپ کا تبادلہ کر دیا۔

مگر آپ کے والد محترم کو یہ جدائی گوارا نہ تھی۔ اس کے علاوہ ان کا آخری وقت آپہنچا تھا۔ انھوں نے ایک دن آپ کو اپنے پاس

بٹھا کر کہا کہ "اب دنیا کے دھندوں کو چھوڑ دو۔ تمہارا خاندان فقیروں کا خاندان ہے۔ میرے نصیب میں تو نہیں تھا مگر تم ناگپور بابا تاج الدین اولیا کے حضور میں حاضر ہونا۔ یہ پانچ پیسے جو میں نے نیاز کے لئے رکھے ہیں ناگپور میں پانچ فقیروں کو تقسیم کر دینا۔ میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ زندگی میں تم استقلال اور صبر کو ہاتھ سے نہ دینا۔ توکل کی زندگی بسر کرنا۔ تمہارا دل پاک ہے۔ ماسوا کو اس کے اندر نہ آنے دینا۔" بھولے بھالے بابا صاحب ان باتوں کو کچھ نہ سمجھ سکے۔ مگر خاموش رہے اور اسی رات آپ کے والد محترم جو منبعِ محبت و شفقت تھے آپ کو اکیلا چھوڑ کر آغوشِ رحمت میں جا سوئے۔

اس کے بعد بابا صاحب پر جو کچھ گذری اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ غم اور تنہائی کے علاوہ خلا کا عالم جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو انسان پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسے آنکھوں کے سامنے کی چیزوں کا احساس تو ضرور ہوتا ہے مگر ایسے ہی جیسے خواب میں دیکھی ہوئی چیزوں کا۔ بابا صاحب جب سے اس دنیا میں آئے شفقتِ پدری کے علاوہ اور ہر قسم کی محبت و شفقت سے نا آشنا تھے۔ بچپن سے دکھڑا سنانے کے لئے اپنی چھوٹی

موٹی ضرورتوں کے اظہار کرنے کے لئے اور محبت بھری نظریں اٹھا کر دیکھنے کے لئے باباصاحب کا ان کے والد کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور وہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

مگر باباصاحب ان کی تلاش میں دیوانہ وار نہیں پھرے بلکہ آپ کی یہ حالت ہو گئی کہ آنکھیں تو کھُلی رہتی تھیں اور ان میں گہرے سمندر کی سی خاموشی طاری رہتی تھی۔ نہ آنسو بہتے تھے نہ آہیں نکلتی تھیں۔ وہ حیرت کا ایک مجسمہ بن گئے تھے۔ آپ کی مثال ان بادلوں کی سی ہو گئی جو بھادوں میں آسمان پر اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں یا اس گلاب کے پھول کی مانند جو تنہا کسی ڈالی پر تند ہواؤں کے مقابلہ میں سرنگوں ہو جائے یا اس بچھڑے کی طرح جو اپنی ماں کے گم ہو جانے پر اڑان مار مار کر چلاّتا ہے۔ اب آپ اس دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ آپ کے اس خاموش غم کا اندازہ اور احساس نہایت دشوار ہے۔ کوئل کی کوک میں وہ درد کہاں۔ آفتاب کے غروب میں وہ غم کہاں جو باباصاحب پر طاری تھا۔

باباصاحب کی تنہائی اس قسم کی تھی جو آفرینش عالم سے پہلے تجلّیاتِ باری کو محسوس ہوتی ہو گی۔ یہی وہ تنہائی ہے جس دور سے گزر کر انسان یکتائی کے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی

وہ سکوت ہے جس سکوت میں مشیت کو تحریک کا موقعہ ملتا ہے اور یہی وہ خلا ہے جس میں حق کو سماتے ہوئے کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔

اب باباصاحب کے لئے دنیا میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اس لئے آپ کو یہاں سے قدم اٹھانا ہی تھا۔ آپ محسوس کرنے لگے کہ جس کی مجھے تلاش ہے وہ نہ تو مسجدوں، مندروں، عید، بقرعید اور تیرتھوں میں ہے اور نہ کتابوں اور وعظوں میں۔ پھر میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ یار دوست اور ساتھی کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ بوالعجبی تو یہ ہے کہ میرے دوست اور اعزا مجھے حق کی طرف سے الٹا پیچھے کھینچتے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کچھ کرو، سرسبز ہو۔ اسلام یہی سکھاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ اسی قسم کے خیالات میں آپ کمبلی گھاٹ کے بڑ کے نیچے تنہا بیٹھے محو رہا کرتے تھے۔

انہیں دنوں میں ناگپور سے حضرت بابا تاج الدین اولیاؒ کی چشم مست کے ایک متوالے جن کا نام حضرت بابا تھاوجے نگرم تشریف لائے۔ چونکہ وہ ناگپور سے آئے تھے اور وہاں کے متعلق باباصاحب کے والد محترم نے وصیت کی تھی اس لئے باباصاحب آداب بجالانے کے لئے ان کی خدمت میں تشریف لے گئے تو حضرت بابا

آپ کی طرف دیکھتے ہی پہچان گئے کہ یہ ایک شہسوار ہے جسے میدانِ جنگ کے لئے تیار کیا جا رہا ہے اور آپ کو بہت دعائیں دیں اور فرمایا کہ تم افضلین میں سے ہو اور تمہارے دل کی مرادیں پوری ہوں گی۔ پھر بھی ان باتوں سے بابا صاحب کے بیقرار دل کو سکون نہ ہوا۔ اور آپ نے اسی روز ناگپور جانے کا فیصلہ کر لیا اور فرمایا کہ میں بغیر ان کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ میرے پیر ہیں۔ وہی میرے قبلہ و کعبہ ہیں۔ میرے دین اور ایمان کی روشنی ہیں۔ اور راہ نما کے بغیر منزل کا نشان نہیں ملتا۔ اپنے اس ارادہ اور خیال سے بابا صاحب کو تقویت اور تسکین ہوئی۔

جس نے مجھے طلب کیا اس نے میرا خیال کیا
جس نے میرا خیال کیا اس نے میرا ذکر کیا
جس نے میرا ذکر کیا اس نے مجھ سے محبت کی
جس نے مجھ سے محبّت کی اس نے مجھ سے عشق کیا
جس نے مجھ سے عشق کیا اس کو میں نے قتل کیا
جس کو میں نے قتل کیا اس کا خون بہا میں خود ہوا

(سلطان باہوؒ)

نہ فکر ہے نہ نظر لا الٰہ الاّ اللہ
ہے ذکرِ قلب و جگر لا الٰہ الاّ اللہ

فنا میں راز بقائے دوام ہے ہمدم
یہی ہے اصل خبر لا الٰہ الاّ اللہ

ہے کائنات کے پردے میں گر جاناں
نظارہ خود ہے نظر لا الٰہ الاّ اللہ

بساطِ عقل ہی کیا جو سمجھ سکے اس کو
حضر میں ہے یہ سفر لا الٰہ الاّ اللہ

اگرچہ کہہ بھی گیا منہ سے لا الٰہ زاہد
رہا بشر کا بشر لا الٰہ الاّ اللہ

شریعت اور طریقت میں فرق اتنا ہے
کہ یہ خبر وہ نظر لا الٰہ الاّ اللہ

بھٹک رہے ہیں بہت کارواں اسی رہ میں
مثالِ حلقہ در لا الٰہ الاّ اللہ

نمودِ عشق فنائے وجود میں مضمر
یہ لا الٰہ کا ثمر لا الٰہ الاّ اللہ

کھنچا ہوا چلا آتا ہے بحر الا اللہ

یہ فیضِ دیدہ تر لا الہ الا اللہ

جو موجِ خونِ تمنّا میں ڈوب کر ابھرے

اسی کا دل ہے گہر لا الہ الا اللہ

پلک جھپکنے میں طے ہو رہی ہے منزلِ عشق

گئے اِدھر سے اُدھر لا الہ الا اللہ

(رحمٰن بابا)

شاہ تاج الدین اولیاء

دُرۃ التاج محمد تاجِ دین تاج الورا

سید حسنی حسینی شاہ تاج الاولیاء

تیغِ برّانِ ولایت دستِ بازوئے علی

تاجدارِ کُن فکانی شاہ تاج الاولیاء

نسبتِ زہرہؓ سے تم پیغمبرِ زہرہؓ ہوئے

یعنی سرتاجِ ولایت شاہ تاج الاولیار

جس کو چاہا، جیسا چاہا جب بھی چاہا کر دیا

اے ولی کے دین و ایمان شاہ تاج الاولیا،

(ولی الدین)

باب ۵

ناگپور

ناگپور جانے کی دھن ایسی سمائی کہ مجبوراً اعزا کو سامانِ سفر کا انتظام کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں رائے پور کی ریل نہیں بنی تھی۔ اور ناگپور کا راستہ کھڑک پور ہوتے ہوئے کلکتہ کی طرف سے تھا۔ بابا صاحب کے ساتھ پندرہ بیس ساتھی بھی تیار ہو گئے، جن میں رحمٰن خان صاحب جو خاص دوست تھے پیش پیش تھے۔ روپیہ اکٹھا ہوا اور چونکہ سب مسافر نوعمر تھے اس لئے پپّو راؤ نامی ایک عمر رسیدہ برہمن وکیل کو آمادہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو حفاظت کے ساتھ زیارت کرانے کے بعد واپس لے آئے۔ پپّو راؤ نے پیسے تو اپنی جیب میں رکھ لئے اور ریل کے ایک ڈبہ میں ان لوگوں کو بغیر ٹکٹ بٹھا کر خود دوسرے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔

انڈاؤسا کے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر نے ٹکٹ طلب کیا تو پپّو نے معلوم نہیں کیوں یا شاید اس خیال سے کہ حضرت بابا تاج الدین صاحب نے جب بلایا ہے تو وہ بے عزّت نہ ہونے دیں گے۔ یا اپنی

جان بچانے کے لئے بابا صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ ٹکٹ ان کے پاس ہیں اور چپکے سے بابا صاحب کے کان میں اصل واقعہ بیان کر دیا۔ اور کہا کہ مجھ سے یہ قصور ہو گیا ہے تم مجھے بچا لو۔ بابا صاحب کو پہلے تو بپّو کی اس رذیل حرکت پر بہت غصّہ آیا مگر موقعہ کی نزاکت اور اپنی بے بسی کے احساس اور ان سب باتوں کے علاوہ منزل پر پہنچنے کی تڑپ نے کچھ ایسا محو کر دیا کہ کچھ نہ بولے۔ ان کی اس خاموشی کا یہ اثر ہوا کہ پورے ڈبّہ میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ اور ٹکٹ کلکٹر کو بھی چُپ سی لگ گئی۔ وہ بابا صاحب کے چہرے کو کچھ دیر تک تو تکتا رہا پھر چپکے سے چلا گیا۔

غیر ذمہ دار دنیا پرست بپّو سارے پیسے اپنی جیب میں دبائے برہم پور اسٹیشن پر یہ کہہ کر کہ مجھے کورٹ میں کچھ کام ہے، سب کو لے کر اتر پڑا۔ مگر اب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ اسٹیشن کے باہر بغیر ٹکٹ کیسے جائیں۔ یہاں بھی بپّو نے شرارت کی اور ریفرشمنٹ روم کے پیچھے والے دروازہ سے نکل گیا۔ دوسرے دن یہ لوگ پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور اس بھروسہ پر کہ بپّو نے ٹکٹ خرید لئے ہونگے کھڑک پور پہنچے۔ یہاں گاڑی بدلنی تھی۔ یہاں بھی پلیٹ فارم سے باہر جانے کا سوال تھا۔ بابا صاحب کو کچھ خبر نہ تھی کہ معاملہ کیا ہے

ہر ایک نے اپنا بستر بغل میں دبایا اور ایک کے پیچھے ایک یہ کہتے ہوئے کہ ٹکٹ پیچھے والے صاحب کے پاس ہیں تم گنتے رہو۔ آخیر میں بابا صاحب تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو آپ نے بیتو کی طرف اشارہ کیا۔ ٹکٹ کلکٹر ایک قوی ہیکل پنجابی تھا اسے بہت غصّہ آیا اور اس نے بہت سی گالیاں دیں۔ بابا صاحب شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ غصّہ تو کیا آتا اُلٹے اس فکر میں پڑ گئے کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

ٹکٹ کلکٹر بابا صاحب کو وہیں بٹھا کر خود شاید رپورٹ کرنے یا کسی اور وجہ سے کہیں اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں جب واپس آیا تو بڑی شفقت سے بابا صاحب سے پوچھا تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں گالیاں دے کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ مجھ کو معاف کر دو۔ مجھ سے جو خدمت بھی ہو سکے گی میں کروں گا۔ بابا صاحب نے کچھ جواب نہ دیا اور اتنا کہا کہ میرے اور ساتھی باہر ہیں ٹکٹ کلکٹر باہر گیا اور ان سب کو بلا کر لے آیا اور بہت ہی عمدہ ناشتہ کرایا۔ پھر اسے جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ناگپور جا رہے ہیں تو ناگپور کا کرایہ سوا تیرہ روپیہ نکال کر بابا صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ تم لوگ

نیک بچے ہو اس پپّو نے تم سب سے دھوکہ کیا۔ بابا صاحب نے سوا تیرہ روپیہ پپّو کو دیدیئے اور پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے۔ پپّو نے ان روپیوں سے سب کو کھانا کھلایا۔

ابھی یہ لوگ پلیٹ فارم پر ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بظاہر متموّل تاجر آپ کی طرف مخاطب ہوا اور پوچھا کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ بابا صاحب نے بتایا کہ ناگپور جا رہا ہوں۔ تاجر نے کہا کہ میرے ساتھ چلو میں تم کو پہنچادوں گا۔ وہ ٹکٹ خرید لایا۔ آپ کے حوالہ کیا اور آپ کو ساتھ لے کر ایک اونچے درجہ میں بیٹھ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بابا صاحب پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اگلے اسٹیشن پر جب آنکھ کھُلی تو وہ تاجر وہاں موجود نہ تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اسے کہیں اور جانا تھا، راستہ میں اتر گیا ہو گا۔ آپ خاموش بیٹھے رہے۔ آپ کے ساتھی بھی اسی گاڑی میں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔

اس زمانہ میں بابا تاج الدین کی بزرگی کا بڑا چرچا تھا، اور اسٹیشن پر بابا صاحب کا نام لینے والوں سے ٹکٹ کی زیادہ پُرسش نہ ہوتی تھی۔ شکردھارا ناگپور سے چار پانچ میل کی دوری پر تھا، جہاں پر بابا تاج الدین اولیاؒ کا مسکن تھا۔ بابا صاحب تانگے سے وہاں پہنچے اور محمد غوث بابا کی جھونپڑی میں جو وجے نگرم کے ہی رہنے والے

تھے ڈیرا ڈال دیا۔

یہ تھا پہلا سفر طالب کا مطلوب کی طرف اور بیقراری کو قرار کی جانب۔ اس سفر میں جو تکلیفیں اور شرمندگیاں اٹھانی پڑیں کیا اس لئے تھیں کہ آپ کے استقلال کی آزمائش ہو اور کیا یہ مراعات اور مشکل کشائی اس لئے رونما ہوئی کہ آپ کے توکل کی بنیاد ہو۔ اللہ والوں کے بھید تو اللہ والے ہی جانیں۔ بہت سے واقعات بظاہر ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر غور کیجئے تو ان میں بہت کچھ مل جاتا ہے اور اگر اتفاقات کہہ کر ٹال دیجئے تو کچھ بھی نہیں۔

مگر یہ یقینی امر ہے کہ کسی بزرگ تک رسائی چاہے اس کی ذات ظہور میں ہو یا پردے میں جب تک خود اس کی طرف سے تحریک نہ ہو ممکن نہیں ہے۔

اب وہ وقت آگیا تھا کہ حضرت بابا تاج الدین اولیاؒ کا جلال جو الم نشرح تھا ایک جمال کے سانچے میں ڈھل کر بابا قادر اولیا میں نمودار ہوا اور "جلالِ کبریائی در جمالِ مصطفےٰ دیدم" کے لئے زمانہ کو جس کی تلاش تھی اس کی تکمیل بابا قادر اولیا کی ذات سے ہو۔

بابا صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ حق کی تمہیں کیا تلاش ہوگی۔ حق کو تم جانتے ہی کیا ہو اور تمہیں خبر کیا کہ خود حق کو تمہاری کتنی تلاش

ہے۔ حق کی آواز ہے کہ تم مجھ میں سما جاؤ اور میرا بول بالا کرو۔ بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ بابا صاحب کو کسی نامعلوم شے کی تلاش تھی۔ ان کا دل کہتا تھا کہ تم ناگپور چلو، وہاں سب کچھ ملے گا۔ مشیت کو بھی آپ کی طلب تھی تاکہ بابا تاج الدین کے ہاتھوں آپ کا سہرا سجایا جائے اور آپ کو دولھا بنایا جائے۔

یہ سفر بھی کیا خوب سفر ہے جو حق کی تلاش میں انسان کرتا ہے۔ دنیا کی چال چاہے کتنی ہی ہیر پھیر کی ہو۔ کتنی ہی اونچ نیچ کی ہو، یہی راستہ جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں، بہت لمبا بھی ہے اور بہت ہی مختصر بھی۔ اس راہ کے مسافر کو ہر ہر قدم پر دل کی سینکڑوں دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں اور جوں جوں منزل قریب آتی نظر آتی ہے۔ اس کی وارفتگی بڑھتی ہی جاتی ہے اور شوقِ خاکی جسم کے وجود کو پھاڑ کر باہر نکل آنے کے لئے تڑپتا ہے۔ کبھی تو دل انتہائی اضطراب سے ساکت ہو جاتا ہے۔ سانس گھٹنے لگتی ہے اور کبھی صبح کی روشنی کی طرح سارے عالم پر چھا کر خود آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ سب تو خیال آرائیاں ہیں۔ بابا صاحب کی کیفیت کیا تھی، ان کا دل کیا چاہتا تھا۔ اس کا اندازہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ فہم و ادراک کا ان میدانوں میں گزر ہی نہیں۔ بابا صاحب بڑھے

لکھے تو تھے نہیں کہ ایسے احساسات کا خیر مقدم کرتے۔ وہ ایک سیدھے سادے بھولے بھالے بچّہ کی طرح تھے۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ ان کا دل سمندر کی طرح جوش مارتا رہتا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ دل کو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش کر دیں۔ اس کارزار میں نہ دماغ کا کام تھا نہ گذر۔ صرف دل تھا اور دل والوں کی دنیا تھی جس میں نہ آسمان کی سمائی تھی نہ زمین کی گنجائش۔

کائنات کی رفتار میں دو قسم کی روشیں دیکھی گئی ہیں۔ ایک ارتقا یعنی وہ مدھم چال جس کو انسان محسوس نہیں کر سکتا کہ اس عرصہ میں اس کی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں دوسری انقلاب۔ یعنی بہت ہی تھوڑے وقت میں فطرت کی طاقتوں کا یکجا ہو کر بم کی طرح پھٹنا اور نمایاں تبدیلیاں ظہور میں آنا۔ پہلا طریقہ جمالی ہے۔ دوسرا جلالی۔ ایک انسان بطنِ مادر میں آنے کے بعد نو ماہ تک تاریکی میں نشو و نما پاتا ہے اور پھر روشنی میں آکر عمر بلوغ تک پہنچنے میں اسے چودہ سال یا اکیس سال لگتے ہیں۔ یہ شعور کی ارتقائی منزلیں اور پیمانے ہیں۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابھی بچّہ صحیح بات بھی نہیں کر سکتا پھر بھی اس کا شعور اچھے اچھوں کے شعور سے بلند تر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ

اس نے ارتقا کے بجائے انقلاب کے ذریعہ ترقی کی ہے۔

حیاتِ انسانی میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ مصلحین اور مجددین زمانہ کو نیکی کی طرف دعوت دیتے اور بھلائی کی طرف بلاتے رہتے ہیں اور انسانیت پر کچھ نہ کچھ احسان کر کے زمانہ کی منتشر طاقتوں کا رُخ پھیر دیتے ہیں مگر جب انحطاط اور بے بسی اپنی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انقلاب بغیر کام نہیں چلتا۔ ایسے ہی زمانہ میں ایک روحانی آتش فشاں ظہور میں آتا ہے اور صدیوں سے مٹی کا ڈھیر جن جذبات کو دبائے رکھتا ہے۔ اسے پھاڑ کر روحانی قوت بخشتا ہے اور روح کی طرح جلاتا بھی ہے اور چلاتا بھی ہے۔

ایسی ہستیاں رشد و ہدایت کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ روحانی ذوالفقارِ علی ہاتھ میں لے کر ساری الحادی قوتوں کو اور مادہ پرستی کے جذبات کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ شمس تبریز کی ذات ایسی ہی تھی اور تاریخ انسانی میں ایسی بہت سی ہستیاں گزری ہیں مگر چونکہ ان کا دائرۂ عمل صرف باطن سے تعلق رکھتا تھا اس لئے ظاہری دنیا میں وہ مجذوب اور پاگل کی طرح آئیں بھی اور چلی بھی گئیں اور آج ان کا نام تک بھی کوئی نہیں جانتا۔ ناگپور کے بابا تاج الدین اولیاؒ ایسی ہی ہستیوں میں سے تھے۔ ان کے جلال کی

قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ بظاہر وہ ایک مجذوب تھے۔ تقریباً برہنہ رہتے تھے۔ دین کی پابندی سے دور تھے۔ گالیاں دیتے تھے غلاظت اور صفائی میں کوئی امتیاز نہ رکھتے تھے۔ مگر بباطن انہوں نے اپنے ہی وجود کی مثال پیش کر کے بہت ٹھوس طریقہ سے ثابت کیا کہ جب روح قدوسیت کے مقام تک پہنچ جاتی ہے تو مٹی کا یہ جسم جو اس کا قالب ہے اس روح کے ساتھ لطافت اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا تھا کہ بابا تاج الدینؒ ابھی یہاں ہیں تو ابھی کہیں اور۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک ہی وقت میں کئی کئی مقامات پر موجود ہیں۔ خواب و خیال میں نہیں، پرچھائیں یا عکاسی کی شکل میں نہیں بلکہ انسانی جسم کے ساتھ۔ عقیدتمندان کے پاؤں چھوتے تھے اور ان کے جسم لمس کو محسوس کرتے تھے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب وہ اپنے مستقر سے باہر نکلتے تھے تو سیکڑوں آدمی ایک ساتھ چیخ چیخ کے اور پکار پکار کر اپنی اپنی مرادیں مانگتے اور شور و غل مچاتے اور وہ بغیر کسی سے مخاطب ہوئے خدا جانے کیا کیا کہتے رہتے تھے اور اسی بڑبڑ میں سوال کرنے والے اپنے جواب پا کر ایسے مطمئن اور خوش ہو جاتے تھے کہ سامنے بٹھا کر بھی کوئی اطمینان دلاتا تو اتنا سکون نہ ملتا۔ یہ تھی کرامت بظاہر ایک پاگل مجذوب

مارنے پیٹنے اور گالیاں دینے والے انسان کی۔

بابا قادر اولیا کو اپنے والد محترم کی وصیت پوری کرنی تھی۔ اس کے سوا نہ کوئی طلب تھی نہ کوشش۔ غالباً دل میں سوچتے رہے ہوں گے کہ اس عجیب قسم کے پاگل سے مجھے کیا لینا ہے۔ سامنے پہنچے تو تاج الدینؒ نے دیکھتے ہی کہا "شیر کا بچہ شیر ہے۔" اور پاس رکھے ہوئے کچھ کیلوں میں سے ایک کیلا اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ بابا قادر نے کیلا لے تو لیا مگر وہ ذرا گلا ہوا تھا۔ مزاج میں انتہائی نفاست اور صفائی تھی۔ طبیعت میں گھن آئی۔ چپکے سے ہاتھ پیچھے کر لیا تو بابا تاج الدینؒ نے کہا کہ تم اسے کھاؤ یا نہ کھاؤ جو تمہیں پہنچنا تھا وہ پہنچ گیا۔

شکر دھارا بستی میں بابا تاج الدین اولیا کے چھ سات مرید تھے جو زیادہ تر مجذوب تھے زائرین بابا تاج الدینؒ کے "بچے" کہلاتے تھے وہاں جو بھی آتے تھے بابا تاج الدینؒ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد ان کے بچوّں کے پاس بیٹھتے تھے اور کچھ وقت صرف کرتے تھے۔ بابا قادر قبلہ بابا تاج الدینؒ سے ملاقات کے بعد ان لوگوں کے پاس پہنچے تو ان میں سے جبلپور

والے بابا صاحب نے قادر بابا کی طرف دیکھا اور لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر چکر کاٹنے لگے اور کھڑے ہو کر کہنے لگے "کہ تمہارے میں کیا کمال ہے۔ تمہارے میں کیا کمال ہے۔ تم نے سب کچھ پا لیا ہے اور ہم یہاں آگ میں بھُن رہے ہیں۔" اگلے دن جب جبلپور والے بابا صاحب بابا تاج الدین کی قدم بوسی کے لئے پہنچے تو ارشاد ہوا "ارے تو ہمارا کیا کمال دیکھتا ہے"۔

حضرت غوث بابا کی جھونپڑی میں بابا صاحب اور ان کے دو ایک ساتھی ٹھیرے ہوئے تھے لنگر خانہ کا انتظام اور خصوصاً بابا تاج الدین کے لئے جو چائے اور کھانا جاتا تھا وہ حضرت غوث بابا ہی کے گھر سے جاتا تھا۔ حیات خاں نامی ایک خادم لنگر خانہ کے مہتمم تھے اور بابا صاحب کو کھانا پہنچانا ان کے ذمہ تھا۔ ان کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ بابا صاحب کا خاص خادم ہوں اور ان کے لئے مر مٹنا میرا دین ہے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ وجیا نگرم کا لڑکا خوامخواہ یہاں پڑا ہوا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا تو آپ کو کلہاڑی دی اور کہا کہ لنگر خانہ کی لکڑیاں پھاڑو یہاں مفت کا کھانا نہیں ملتا۔ بابا صاحب نے جو نازوں کے پلے ہوئے تھے بڑی مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی محنت کی ہو گی کہ ہاتھوں

میں چھالے پڑ گئے اور آکر لیٹ گئے۔ جب حیات خاں کھانا لیکر بابا تاج الدینؒ کے پاس پہنچے جہاں اور لوگ بھی موجود تھے تو بابا تاج الدینؒ نے اوروں سے مخاطب ہو کر اپنے ہاتھ دکھائے ہاتھوں میں چھالے پڑے ہوئے تھے۔ فرمایا دیکھو جی یہ حیات خاں (دو چار غلیظ گالیاں دے کر) ہم سے لکڑیاں پھڑواتا ہے۔ یہ دیکھو ہمارے ہاتھ کے چھالے۔ حیات خاں اور غوث بابا سہم کر رہ گئے کہ یہ کیا پیری مریدی ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ بابا تاج الدین صاحبؒ جس راجہ کے یہاں رہتے تھے ایک دن اس کے مندر میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بابا صاحب وہاں چلے گئے۔ ہلکی سردی پڑ رہی تھی وہاں جاکر بابا صاحب سب سے بڑی مورتی کے سر پر بیٹھ گئے۔ رات کا وقت تھا حیات خاں نے چائے لاکر پیش کی۔ بابا قادر قبلہ بھی دُور ایک کونے میں سرخ شال اوڑھے کھڑے تھے۔ بابا تاج الدین اولیاؒ نے چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر حیات خاں کو دیا اور فرمایا کہ لال شال والے کو پلا دو۔"

حیات خاں سارے مجمع میں ڈھونڈتے پھرے۔ لال شال والے ایک ہی تھے۔ حیات خاں کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اشارہ اس الہڑ لڑکے کی طرف بھی ہو سکتا ہے خصوصاً جبکہ بزرگ عالم اور زاہد برسوں کی کٹھن ریاضت کئے ہوئے فقیر اس ہجوم میں موجود تھے۔ حکم سے مجبور تھے۔ چائے کا گلاس آپ کو دیا اور بابا قادر قبلہ نے نوش فرمایا۔

ناگپور کے قیام کے زمانہ کو یاد کر کے بابا جان نے فرمایا۔ ناگپور میں بڑے آم کے درخت کے پار کھیت تھے۔ اس میں ناگر کر مرچیں، بھنڈی، کپاس، امبارہ بوئے ہوئے تھے۔ مرچیں چپٹی اور چار پانچ انچ لمبی۔ ایک طرف سرخ ایک طرف سبز اور بہت کم بیج۔ مرچوں کو دیکھ کر طبیعت للچائی۔ رحمٰن خاں نے ایک تولیہ بھر کر مرچیں توڑیں اور درختوں کے نیچے سے املی کی بوٹ توڑ کر املی کا کھٹا بنایا۔ میں نے خوب کھایا۔ جب بابا تاج الدینؒ کے پاس پہنچے تو ارشاد ہوا۔ "باپ دادا کا کھیت تھا۔ بغیر اجازت کیوں لیں مرچیں۔" رحمٰن خاں بہت شرمندہ ہوئے میں نے یہ سوچا کہ مالی ملتا تو ۲ آنے چار آنے دیدیتا۔ سستا زمانہ تھا۔ تین پیسے میں ایک ٹوکرہ مرچیں یا بھنڈی آجاتی تھیں۔

ایک بار فرمایا۔ ناگپور میں باباتاج الدینؒ کے تانگے کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ایک پہلوان نے ایک سیتاپھل چھیل کر بابا صاحب کو دیا۔ باباصاحب کی ناک سے رینٹھ، منہہ سے رال اور آنکھوں سے چیپڑ جارہا تھا۔ کچھ منہہ میں ڈال کر پھر نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مجھے اتنی گھن آئی کہ ہاتھ کو دور رکھ کر منہہ پھیر لیا۔ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ باباصاحب نے فرمایا "تم ہمارا جھوٹا کیوں کھاتے"۔ ایرگاؤں کی ندی میں ریت سے رگڑ رگڑ کر خوب ہاتھ دھویا اور دیکھتا رہا کہ اس کا اثر ہاتھ کے اندر تو نہیں گیا۔ لوگوں نے ہاتھ چاٹ چاٹ کر صاف کر دئے۔ دو سال سوچتا رہا کہ کھالیتا تو اچھا ہوتا۔ مگر ایک دن باباصاحب نے پورا ناشتہ دان بغیر کھولے جس میں ہرن کا پکا ہوا گوشت تھا میرے لئے بھیجا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دن صبح کے وقت باباقادر حوائج ضروری کے لئے رحمٰن خاں صاحب کے ساتھ جنگل کی طرف گئے تو دیکھا کہ باباتاج الدین کا تانگہ دور سڑک پر چلا جارہا ہے اور خلقت پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ ٹھیک اسی وقت دیکھا کہ باباتاج الدینؒ ان کے پاس تشریف لائے۔ آپ سے کچھ

باتیں کیں اور غائب ہو گئے۔

فقیروں کی اصطلاحیں اور زبان عجیب ہوتی ہے۔ بابا تاج الدین کبھی سیدھی بات نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مارواڑی اپنی بیوی اور اپنے اکلوتے بچّہ کو لے کر کاٹھیاواڑ سے ناگپور آیا۔ بچّہ دن رات چیختا تھا۔ مارواڑی حکیموں اور عاملوں کو دکھا کر تھک چکا تھا۔ بچّہ کو جب بابا تاج الدینؒ کے سامنے پیش کیا تو ارشاد ہوا "چولھے میں ڈال دے"۔ یہ فقرہ مارواڑی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اور اس کی بیوی بہت مغموم ہوئے کہ ہم کن امیدوں سے یہاں آئے تھے۔ اور بابا صاحب کیا فرماتے ہیں۔ وہ دونوں مایوس جا رہے تھے کہ راستہ میں بابا قادر اولیا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان سے حال پوچھا۔ اس کے بعد بابا قادر ہنسے اور کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ مرچیں وار کر چولھے میں ڈال دو۔ بچّہ کو نظر لگ گئی ہے۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور بچہ کو آرام ہو گیا۔

ایک اور واقعہ ہے۔ جادرہ کے نواب کی بیگم صاحبہ اور ان کی صاحبزادی نوابی کرّوفر سے بڑے بڑے طباقوں میں مٹھائیاں خوشبو اور عمدہ لباس لے کر بغرض نیاز دربار میں حاضر ہوئیں۔ قدمبوسی کے بعد بابا صاحب نے فرمایا "سوکھا ناریل، نیا گڑ اور

تازہ چنوں میں بڑا مزا آتا ہے۔" بیگم صاحبہ یہ سمجھیں کہ شاید بابا صاحب کو یہ مٹھائیاں پسند نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی فوراً مع اپنے ساتھیوں اور ملازموں کے شہر پہنچیں۔ رات کے بارہ بج چکے تھے دکانداروں کو جگایا گیا۔ گڑ اور کھوپرا خریدا گیا۔ بھڑبھوجے کو جگا کر تازہ تازہ گرم چنے لئے گئے اور طباقوں میں بھر کر واپس آئے اور بابا تاج الدین کی خدمت میں پیش کیا۔ مگر بابا صاحب نے نہ کچھ کھایا اور نہ کچھ کہا۔ اس پر بیگم صاحبہ کو فکر ہوئی کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے کہ بابا صاحب نے نذر قبول نہیں کی۔ اتفاق سے قادر بابا صاحب ادھر سے گزر رہے تھے۔ ان سے اس کا ذکر کیا کہ آپ ہی بتائیں کہ مجھ سے کیا قصور ہوا۔ بابا صاحب نے تھوڑی دیر غور کر کے فرمایا۔ "سوکھے ناریل سے مطلب اللہ ہے، نئے گڑ سے مطلب آخری نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور تازہ چنوں سے مطلب ولیِ وقت خود بابا صاحب ہیں۔ یہ سننا تھا کہ بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمانے لگیں کہ میں اسی مسئلہ کو حل کرنے آئی تھی کہ خدا۔ رسول اور پیر ان تینوں میں سے توحید کو کیسے پائیں۔ میرا دل روشن ہو گیا ہے اور سب کچھ سمجھ میں آگیا ہے۔ بیگم صاحبہ بابا قادر صاحب پر بہت

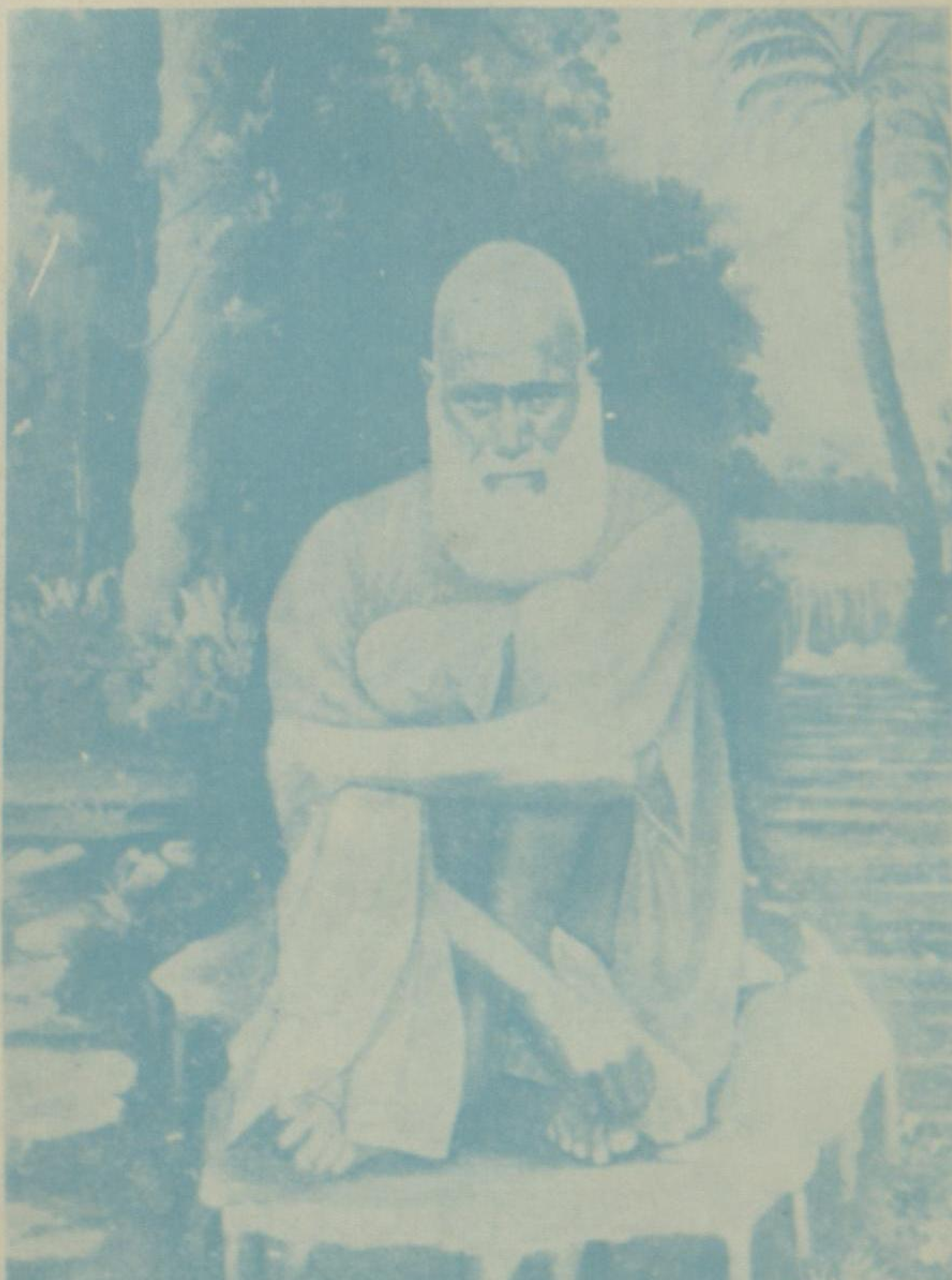
مہربان ہوئیں اور متمنی ہوئیں کہ آپ ان کے ساتھ جاورہ چلیں، اور وہیں قیام فرمائیں۔ مگر ہمارے بابا صاحب نے اس کو قبول نہ فرمایا اور قبول فرماتے بھی کیسے۔ ان کو تو وجے نگرم کے جنگل میں چنے چبانے۔ ناریل گڑ اور چنوں کی توحید رچانی تھی۔

فقراء کی باتیں عجیب ہوتی ہیں۔ ان کے مذہب میں ایک ہی گناہِ کبیرہ ہے اور وہ یہ کہ کسی کا دل دکھائیں یا مردم آزاری کریں۔ اس لئے فقیر اگر کسی کو تنبیہہ کرتا ہے تو اس سے مقابل ہو کر گفتگو نہیں کرتا۔ کسی اور کو مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جو مخاطب کے ذہن میں ذرہ بھر نہیں آتیں اور جس طرف اس کا اشارہ ہوتا ہے وہ سر نیچا کر کے ہر ایک بات کو سمجھتا ہے اور اسے اوروں سے ظاہری شرمندگی نہیں ہوتی۔ اور اس کی انا کو بھی صدمہ نہیں پہنچتا کہ مجھے یوں کہا گیا۔ ہمارے بابا صاحب فقیرانہ اخلاق کے مجسمہ ہیں۔ کسی انسان کا تو ذکر ہی کیا۔ کبھی کُتّے کا دل بھی نہیں دُکھایا۔ وہ جانوروں کے دل کو بھی ایسی ہی اہمیت دیتے ہیں جیسے اپنی جان کو۔ اکثر فرماتے ہیں کہ سب کا دل ایک ہے چاہے چرند ہو، پرند ہو یا انسان۔ آپ اصطلاحی زبان کے ادیب کامل ہیں۔ روزمرّہ کی معمولی گفتگو میں جو لفظ منہ سے نکلتا ہے اس

معنی در معنی ہوتے ہیں اور اتنے لطیف اشارے کہ جس کی سمجھ میں کچھ آجاتا ہے وہ کندن بن جاتا ہے۔

محمد غوث بابا کی جھونپڑی کے آگے ایک بہت پرانا املی کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے بابا قادر اور رحمٰن خاں صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ رات کے چار بجے تھے کہ بابا قادر نے کچھ غنودگی اور کچھ جاگنے کی حالت میں دیکھا کہ دو بڑی بڑی الماریاں ہیں جن کی دو چاندی کی کنجیاں کسی نے آپ کے حوالہ کیں اور کہا کہ کھولو۔ جب بابا صاحب نے قفل کھولے تو ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی اور دوسری الماری میں صرف ایک خانہ خالی تھا۔ بابا صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی ان کو جگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ حق ہے۔ اس خالی خانہ کو تمہیں بھرنا ہے۔ اسی وقت وہیں کی رہنے والی ایک بڑھیا جو جھاڑو دینے کی غرض سے اٹھی تھی اس نے دیکھا کہ بابا تاج الدینؒ اسی درخت کے نیچے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس نے شور مچانا شروع کیا۔ اٹھو اٹھو رے لڑکو بابا صاحب آگئے۔ رحمٰن خاں بھی شور سن کر اُٹھے تو دیکھا کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

دن کے وقت حضرت غوث بابا نے قادر بابا سے پوچھا کہ



تجلی ـ ناگپور

رات کو بابا تاج الدین نے آپ کو کیا دیا۔ بابا قادر معصوم اور بھولے تو تھے ہی انھوں نے ساری باتیں بتادیں۔ حضرت غوث بابا کو ایک دھکا سا لگا اور کافی صدمہ ہوا۔ اپنے آپ سے کہنے لگے کہ یہ کیا ماجرا ہے مجھے خدمت کرتے اور طلب میں جلتے ہوئے ایک عمر گزر گئی" تاج الدین یہ تم نے کیا کیا کہ اس لڑکے کو تم نے چابیاں حوالہ کردیں"۔ اور پھر قادر بابا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ "تمہیں یہ راز کسی کو بھی نہ بتانا چاہیئے۔ مگر خیر شیر کا بچہ شیر ہی ہوتا ہے"۔ بابا تاج الدین بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ آخر اس مشعل کو کہیں نہ کہیں قیام کرنا ہی ہے۔

ہم لوگ وقت کو گھڑی اور دن رات کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ عاشق وقت کو دل کی دھڑکنوں سے ناپتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام آبِ حیات کی تلاش میں نکلے تو ان پر کیا کچھ گزری مگر انھوں نے بالآخر آبِ حیات پی ہی لیا۔ دولتِ سرمدی کا متحمل وہی ہوتا ہے جس کو مشیت اس کا اہل سمجھ کر خود اس کی پرورش کرتی ہے۔ محنت کی اُجرت تو سب کو ملتی ہے لیکن اس نوری دولت کے مالک سب کہاں ہوتے ہیں۔ بابا صاحب کی نہ تو کوئی تعلیم تھی نہ تربیت۔ انہیں نہ کوئی وظیفہ پڑھنا پڑا نہ چلہ کشی کرنی پڑی۔

غیب کے بھید کون جانے ایک نظر میں سب کچھ ہو گیا۔ وہ امانت جو حضرت مولا علیؓ کے توسط سے چلی تھی سینہ بہ سینہ بابا قادر اولیاءؒ تک پہنچ گئی۔ وہ الماریاں کیا تھیں۔ ان کی کنجیاں بابا صاحب کو کیوں دی گئیں۔ ایک خالی خانہ کس چیز سے پُر ہو گا۔ یہ غیب کی باتیں ہیں۔ غیب کا بھید کس نے پایا ہے۔ یہ مقام سر خفی بلکہ اخفا سے بھی بالاتر ہے۔ مٹی کے پتلوں کا سارا علم اور شعور قبر تک ختم ہو جاتا ہے۔ ابدی اور ازلی معموں کے راز کو کیا سمجھا جا سکتا ہے۔

گزرگاہِ تصوّف میں اک ایسا بھی مقام آیا
جہاں نورِ محبّت کے سوا کچھ بھی نہ کام آیا
وہ جوشِ جذب ہے منزل نگاہوں میں سمٹ آئی
اندھیرے جگمگا اُٹھے جو لب پر تیرا نام آیا
حضورِ عشق پھر شاید کوئی غنچہ دہن پہنچا!
چمن میں رنگ و بو کو پھر سے وحشت کا پیام آیا
ضمیرِ کن فکاں میں موجزن ہے بادۂ وحدت
بقدرِ وسعت ہر جام سب کو اذنِ عام آیا
بھڑک اُٹھے ازل کے ساز سے تخلیق کے نغمے
بھری محفل میں جس دم حضرت قادر کا نام آیا

(رحمان بابا)

نذرِ عقیدت بحضور تاج الاولیاء حضرت بابا تاج الدین رح
ناگپوری قدس سرہٗ ۲۶ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ

حقیقت کے امیں تم ہو ولایت کے نگیں تم ہو
پڑھیں صلِّ علیٰ تم پر کہ قرآنِ مبیں تم ہو
تم ہی روحِ نبی ہو کنتُ کنزاً مخفیاً تم ہو
غرض یہ ہے کہ تاج الدیں تم ہی تم ہو تم ہی تم ہو
جو چمکی تھی ازل میں وہ شعاعِ اولیں تم ہو
ملا ورثہ میں احمد سے جو نورِ آخریں تم ہو
محمد کی محبت بن کے ٹپکی انگبیں تم سے
ھوالاول ھوالآخر کی شانِ دلنشیں تم ہو
سراپا رحل و قرآں ہے نشستِ جسمِ قدوسی
اسی عرشِ الٰہی پہ ھدیً للمتقیں تم ہو
تم ہی سالارِ دیں ہو چودھویں صدی میں امت کے
بشارت جس کی آئی تھی وہی فتحِ مبیں تم ہو
تم ہی نے لا الٰہ کو جذب کر کے جسمِ خاکی میں
ابھارا نقش الا اللہ شمس العارفیں تم ہو

تم ہی ہو نقشبندی قادری، چشتی، سہروردی
تم ہی تکمیلِ دینِ مصطفےٰ اسرتاجِ دیں تم ہو

تم ہی ہو بوتراب و بوعلی و شمس تبریزی
ادائے قم باذنی صورتِ عین الیقیں تم ہو

مسیحائے زماں ہو باطن و ظاہر پہ قادر ہو
عجب ہے شانِ محبوبی کہ شانِ عالمیں تم ہو

تم ہی تفسیرِ والنوری، تم ہی تعبیرِ والشمس
تم ہی بدر الدجیٰ، الشمس الضحیٰ انوارِ دیں تم ہو

تم ہی حکمت، تمہیں عرفاں تم ہی لیٰسیں تمہیں طٰہٰ
تم ہی ہو جانِ جاں۔ جانِ حقیقت، جانِ دیں تم ہو

تم ہی نے ماؤ تو کو ختم کر دینا سکھایا ہے
ھو اللّٰہ احد کے معنئ شرعِ متیں تم ہو

پلٹ کر رنگ باطن دھو دیئے ظاہر کے سب نقشے
اندھیرے ہو گئے روشن کہ ماہِ کاملیں تم ہو

پڑھیں صلِّ علیٰ تم پر کہ قرآنِ مبیں تم ہو

(ولی الدین)

باب ۶ سُہاگ

بابا قادر قبلہ وجے نگرم لوٹ آئے۔ وہی گھر، وہی اعزا، وہی دن اور وہی رات۔ مگر دنیا کس قدر بدلی ہوئی تھی۔ اب ہر کوئی یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ وہ الھڑ لڑکا نہیں ہے۔ یہ بلاشبہ بابا ہیں۔ ان کے ساتھی بھی جو بچپن میں ساتھ کھیلتے تھے بجائے نام لینے کے حضرت کہہ کر پکارتے تھے۔ کچھ دنوں تک اپنے آبائی مکان میں قیام فرمایا۔ پھر وہیں ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ لوگ ملاقات کے لئے آتے تھے مگر آپ بہت کم بولتے تھے۔ اور زیادہ تر اوکڑوں سر کو گھٹنوں میں دبائے ہوئے جس طرح بابا تاج الدین بیٹھا کرتے تھے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ سر کے بال، داڑھی، مونچھ اور ناخن اپنی رفتار سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سردی ہو یا گرمی۔ دن ہو یا رات۔ ایک ہی عالم تھا۔ کون سا آفتاب سمایا تھا جس کی گرمی سے ہر وقت پسینہ میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے اور جھونپڑی میں جو بھی کوئی داخل ہوتا تھا سہم کر چُپ ہو جاتا تھا۔ کوئی چونکا کر چائے پیش کر دیتا تو پی لیتے اور بہت مجبور کرتا تو ایک آدھ

لقمہ چاول کا مُنہ میں ڈال لیتے اور دوسرے چوتھے دن کھمبلی روڈ پر اسی بڑ کے نیچے جہاں آپ کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تھی جا کر بیٹھ جاتے۔

بڑ کے درخت کو ایک سادھو نے نشانی کے طور پر کوئی بیس سال قبل لگایا تھا جو قریب ہی کے پھول باغ میں رہتا تھا۔ وہاں کے مالی کا کہنا ہے کہ اس سادھو نے پیشن گوئی کی تھی کہ "یہ جگہ بالکل بدل جائے گی۔ اس جنگل پر جو درندوں کی وحشت اور قہر برس رہا ہے وہ شانتی، امن اور روشنی سے بدل جائے گا۔ میں تو نہیں رہوں گا مگر میری عقیدت کی نشانی ایک بڑ کا درخت ہو گا جسے لگا کر جا رہا ہوں۔" اس نے مالی کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ پیڑ جڑ نہ پکڑ لے تم اس کو پانی دیتے رہنا۔ سادھو تو چلا گیا مگر وہ پیڑ ایک گنجان درخت ہو گیا ہے۔

جو مقام آج قادر نگر کہلاتا ہے اور جہاں آج بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں، پکی سڑک بنی ہوئی ہے اور لوگوں کی قطار در قطار آتی جاتی ہیں وہ ۱۹۲۲ء سے پہلے یعنی جب سے حضرت بابا قادر قبلہ نے اسے اپنا مسکن بنایا عجب جگہ تھی۔ اس زمانہ

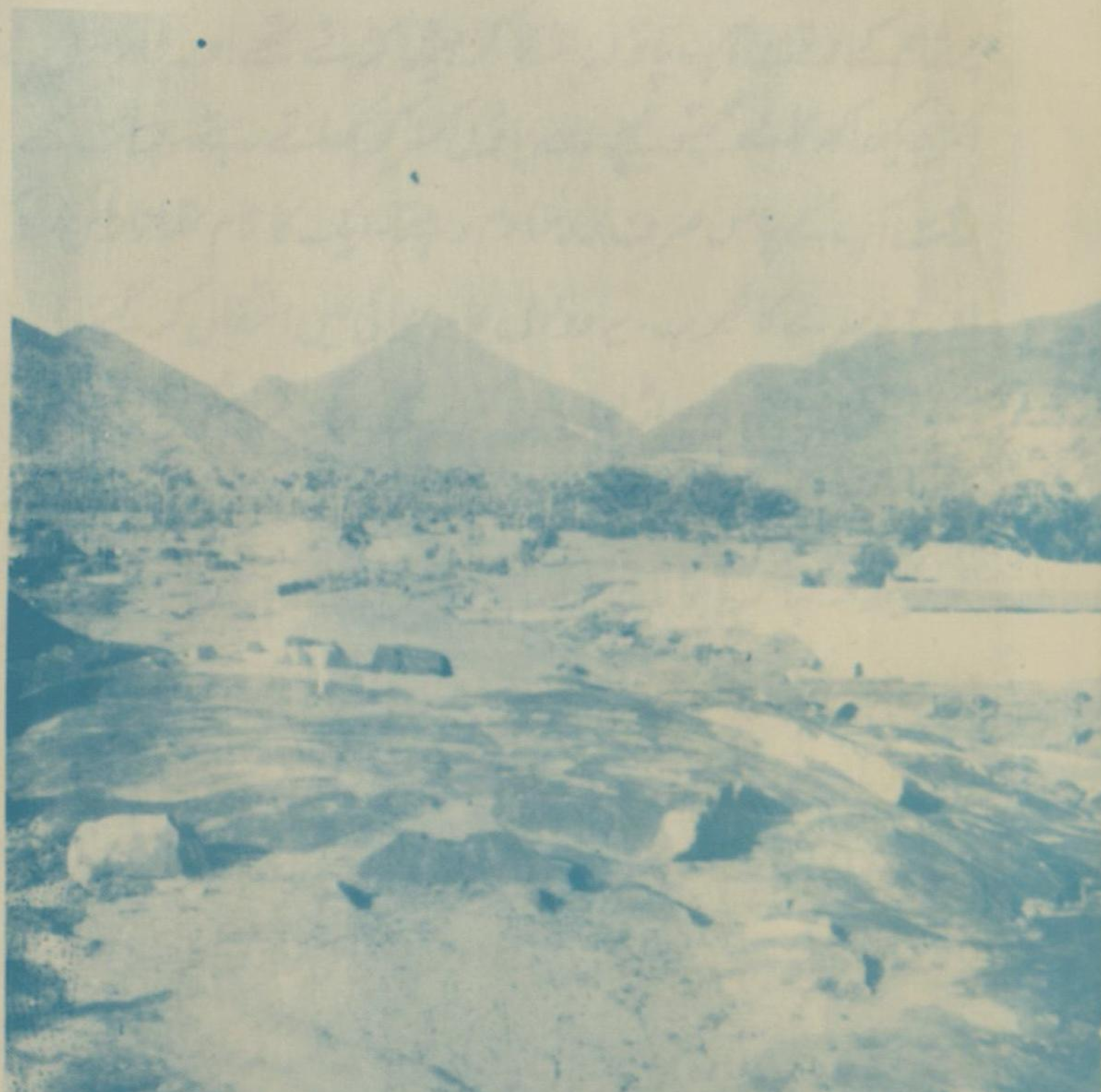
یہیں وجیانگرم شہر کے شمال مشرق میں پرانی اور خستہ شاہی زمانہ کی بنی ہوئی ایک سڑک تھی جو آگے پہاڑیوں کے گھاٹ سے گزر کر سمندر کی طرف جاتی تھی۔ یہ غالباً اگلے بادشاہوں کی شاہراہ تھی مگر صدیوں کی غفلت سے خستہ ہو چکی تھی اور بیل گاڑی بھی اس پر مشکل سے چل سکتی تھی۔ وجیانگرم کا شہر چھوڑ کر بائیں ہاتھ پر مرگھٹ اور بڑی بڑی چٹانوں کی پہاڑیاں اور اس میں چیل بین (ناگ پھنی) کے جھنڈ اور خار دار جھاڑیوں کے جنگل اور سانپوں کے اونچے اونچے بیٹے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر بھی ایسا ہی جنگل تھا اور کچھ آگے بڑھ کر تقریباً میل دو میل کے فاصلہ پر اسی بڑ کے درخت کے پاس اونچی اونچی لمبی چٹانوں کی تین صفیں تھیں۔ درمیانی چٹان پر بابا صاحب قبلہ نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ آس پاس کانٹوں کا ایسا گھنا جنگل تھا کہ ایک خرگوش کا بھی گذر مشکل تھا۔ سانپ اور بڑے بڑے کالے بچھوؤں کی اتنی کثرت تھی کہ دن دہاڑے اگر کوئی شخص وہاں بیٹھ جائے تو بچھو اس کا پیر کتر کر کھا جاتے تھے۔ شام ہوئی نہیں کہ گیدڑوں کی پکار اور بھیڑیوں کا شور۔ دو فرلانگ پر شیر کی دھاڑیں۔ قوی سے قوی آدمی کا دل دہلانے کے لئے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ

اس سڑک پر ارواحِ خبیثہ اور جنوں کے واقعات اتنے مشہور تھے کہ ہمت والے بہادر بھی گھبراتے تھے۔

ایسے جنگل میں جو وحشت اور خوف، تاریکی اور دہشت کا مرکز تھا سیدھے سادے بھولے بھالے نوعمر بابا صاحب جو کبھی اپنے گھر میں بھی سرِ شام پیشاب کی خاطر اپنے باپ کا ہاتھ پکڑے بغیر باہر نہ نکلتے تھے، قیام فرما ہوئے تھے۔ وہ کون سی طاقت تھی اور کون سا یقین تھا جس نے آپ کو وہاں قیام کے لئے نڈر بنا دیا تھا۔ کیا بابا صاحب اپنی قوت سے ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی قوت و ہمت رکھتے تھے یا فطرت کی نیست کرنیوالی طاقتوں سے لڑائی کرنے کے لئے آئے تھے، یا صرف رضائے الٰہی کے آگے سر جھکا کر توکّل کی زندگی اختیار کر کے سکون کے ساتھ رہنے کے لئے۔ اس کا فیصلہ مشکل نہیں ہے۔ فقیر کے دل میں ماسوا کی گنجائش نہیں رہتی۔ پھر کیسے سانپ اور کیسے شیر اس کا دل محبت سے پُر ہوتا تھا۔ اس میں خوف کی گنجائش ہی کہاں۔ ایک دفعہ جب اس کا دل جاگ جاتا ہے تو ہر چیز کو چاہے وہ ارواحِ خبیثہ ہی کیوں نہ ہوں خدا کی مخلوق سمجھ کر یگانگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور کوئی غیریت محسوس نہیں کرتا۔

جو شخص اس کیفیت سے خالی ہوتا ہے اس کی مادی فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم و جان کی حفاظت کرے اور خطرات سے بچے مگر جو شخص مشغول ہو جس کی نس نس اور روئیں روئیں سے یاھُو کے نغمے پھوٹتے ہوں اس کو بھلا ان چیزوں کا کیا خوف اور کیا خیال۔

بابا صاحب قبلہ تقریباً دو سال تک ناگپور سے لوٹنے کے بعد رات کو اپنے گھر میں قیام فرماتے تھے۔ بچپن کے دو چار ساتھی آپ کے ساتھ ہر وقت لگے رہتے۔ جب آپ مکان پر تشریف فرما ہوتے تو بہت سے اہلِ غرض قدم بوسی کو آتے اور بلا امتیاز ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور فرماتے۔ زبان کیا تھی شمشیر برہنہ تھی۔ جس کے لئے جو کچھ کہا وہ ہو کر رہا مگر جیسا کہ ہوتا آیا ہے اپنوں سے زیادہ غیر ہی فیض اٹھاتے ہیں۔ اپنوں میں یقین کا پیدا ہونا مشکل ہے کہ اپنے ہی ساتھ کا ایک شخص ولی اللہ ہو گیا ہے اور کرامتیں اس کے قدم چومتی ہیں۔ دو سال کے بعد بابا صاحب مستقل اس چٹان پر رہنے لگے جہاں کبھی کبھی جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ دھوپ سے بچانے کے لئے ساتھیوں نے پتھر میں ایک سوراخ کر کے ایک تارپان کی چھتری نصب کر



قادر نگر

دی تھی۔ اس سے ذرا آگے اسی چٹان پر بیٹھنے کی ذراسی جگہ تھی جس پر شام کے وقت آپ پاؤں لٹکا کر بیٹھا کرتے تھے اور خادموں نے اکثر دیکھا کہ کالے بچھّو نیچے سے پاؤں کتر کر کھاتے رہتے۔ رات کے وقت آپ کے پاس صرف دو خادم رہتے۔ ایک کا نام تھا نارائن راؤ اور دوسرے کا محبوب۔ یہ دونوں عالم جوانی میں انتقال کر گئے۔

آس پاس کی پہاڑیوں میں گنوڈر کے سنگ تراشوں کی ٹولیاں پتھر نکالنے کے لئے آتی تھیں۔ ان لوگوں میں سے ایک شخص نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ اجازت ہو تو میں انہیں پتھروں کے چار ستون بنا دوں اور اس چٹان میں نصب کر دوں۔ ان پر پاس کے جنگلوں سے تاڑپان اور بانس لاکر ایک جھونپڑی بھی بنائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ اسی جھونپڑی میں دن بھر پڑے رہتے۔ صبح کے وقت شہر کے بہت سے لوگ آتے اور پاس کی سڑک پر قطاریں بیٹھے رہا کرتے۔ آپ کو جھونپڑی سے کوئی اٹھا کر اگر لے جاتا تھا تو چلے جاتے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی غرض سُن کر دعا فرما دیتے۔ پھر دس پندرہ منٹ کے بعد جھونپڑی میں آکر لیٹ جاتے۔ آپ کے پاس صرف غربا آتے اور اپنی مصیبتوں کا علاج پاکر خوش خوش چلے جاتے۔ شہر کے مسلمان خصوصًا مولوی اور پڑھے لکھے لوگ

بھول کر اس طرف کا رُخ نہ کرتے بلکہ کبھی ذکر بھی آجاتا تو قہقہہ لگا کر کہتے کہ دیکھو تو ہمارے سامنے کا لڑکا بابا بن گیا ہے ۔ ہم نے ایسے بابا بہت دیکھے ہیں ۔

کھانا صرف ایک وقت آپ کی والدہ صاحبہ کے پاس سے ایک چھوٹی سی پیالی میں آتا۔ جو ایک خادم دن کے وقت لایا کرتا۔ یہ تکلیف آپ کو جان بوجھ کر دی جاتی تھی تا کہ آپ اس زندگی سے باز آئیں اور گھر میں دنیا دار کی طرح زندگی بسر کریں۔ اس پیالی میں سے ایک آدھ لقمہ آپ کھالیتے اور باقی آپ کے خادم کھا کر پڑ رہتے البتہ کوئی گوالا اُدھر سے گزرتا اور عقیدت سے دودھ پیش کرتا اور کسی کی لائی ہوئی چائے کی پڑیا بھی ہوتی تو آس پاس کے جھاڑوں سے تنکے جمع کر کے چائے بنائی جاتی تھی۔ جس میں سے بابا صاحب ایک دو گھونٹ پی لیتے اور باقی سے خادم سیر ہوتے۔ یہی توکّل کی زندگی تھی۔ اللہ ہی اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ کلمہ طیبہ پڑھنا کمال نہیں بلکہ خود کلمہ طیّب ہو جانا کمال ہے ۔ فقیر گو ظاہر میں کلمہ نہ پڑھتا ہو، باطن میں خود کلمہ ہو جاتا ہے جو اسی مٹی کے پتلہ کو طیّب بنا دیتا ہے ۔

اسی زمانہ کا حال ہے کہ تقریباً چھ ماہ تک سخت خونی پیچش

میں مبتلا رہے۔ نہ کوئی دوا تھی نہ دارو اور وہ جو دو ایک لقمہ غذا تھی وہ بھی نہ رہی۔ کبھی تھوڑی سی چائے کا سامان ہوگیا تو پی لی ورنہ وہ بھی نہیں۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک ایسا سخت ملیریا رہا کہ ایک گھونٹ چائے بھی آنتیں گوارا نہ کرتی تھیں۔

بخار کی سخت شِدّت میں تھوڑا سا پانی ضرور پی لیا کرتے تھے۔ جسم پر صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں اور ہڈیوں پر کھال لپٹی ہوئی تھی ــــ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ اور ڈاڑھی کے بال قلندرانہ بے باکی سے ہر طرف پھیل گئے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر آپ ہر وقت باہوش رہا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی بات کرتا تو جیسے کہیں دُور سے آواز آرہی ہو اس کو تسلّی بخش جواب دیتے تھے۔ آپ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہتی تھیں اور چہرے پر اس قدر جلال طاری رہتا تھا کہ بات کرنے کی بڑے بڑوں کو ہمّت نہ ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں خادم تک سامنے نہ آپاتے تھے اور پیچھے سے لاکر پانی یا چائے مُنہ سے لگا دیا کرتے۔

اس زمانے کے واقعات شاہد ہیں کہ آپ کے مُنہ سے جو بات نکلتی تھی وہ حق کا فرمان ہوتی تھی۔ کسی کو اگر کسی سے عداوت ہوتی اور اپنے دشمن کی بربادی چاہتا تو وہ خادموں سے دوستی کرکے بابا صاحب

کے منہ سے کہلوادیتا تھا کہ فلاں مرجائے گا۔ ادھر بابا صاحب کی زبان سے بات نکلتی تھی اور ادھر اس کا خاتمہ ہوجاتا تھا۔ کبھی کسی نے اپنی غربت کی شکایت اور دھن دولت کے لئے کہلوادیا تو چند ہی روز میں اس کے یہاں دولت امنڈنے لگتی۔ چاہے وہ دولت اس کے لئے مفید نہ ہوتی مگر ہوتا ایسا ہی تھا۔ جذامی، کوڑھی، لاولد ہر کسی کا بغیر سوچے سمجھے چٹ پٹ معاملہ ہو جاتا۔ مگر اس زمانے میں لوگ آپ سے بہت ڈرتے تھے۔ سامنے اگر آبھی جاتے تو ان پر ایسی ہیبت طاری ہوتی کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی اور منہ سے آواز تک نہ نکلتی۔

اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ سردیوں کا زمانہ تھا بابا صاحب اپنی جھونپڑی میں شال اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ آپ نے محسوس کیا کہ دائیں پاؤں کے انگوٹھے کی جڑ میں کسی چیز نے کاٹا ہے۔ آپ نے پیر جھٹک دیا اور بغیر اٹھے ہوئے پیروں کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا کالا سانپ جھونپڑی کے دروازے سے نکل کر باہر چلا جارہا ہے۔ آپ نے کسی سے کچھ نہ کہا اور سڑک کے پار دھوبی گھاٹ کے پاس جو بڑی چٹان تھی اس پر جاکر لیٹ گئے۔ آپ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور غنودگی چھا گئی۔ خادموں نے یہ سوچا کہ شاید آرام کر رہے ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں

جب یہ دیکھا کہ منہ اور ناک سے ہرے اور نیلے جھاگ نکل رہے ہیں تو سمجھ گئے کہ کسی سانپ نے کاٹا ہے۔ فوراً آس پاس کے جنگل سے کچھ دھوبیوں اور چرواہوں کو بلا لائے۔ انہوں نے جسم کو ٹٹولا اور انگوٹھے کے نیچے ایک نشان دیکھا، آنکھیں کھول کر دیکھیں پُتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ جبڑے بند تھے اور بدن سخت ہو چلا تھا۔ خادم چٹان پر سے اٹھا لائے اور جھونپڑی میں شال اُڑھا کر لٹا دیا۔ خادم اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ نہ کسی ڈاکٹر کو بلا سکتے تھے نہ کوئی اور ترکیب ان کی سمجھ میں آتی تھی۔ بیچارے نہایت ہی مغموم اور متفکر جھونپڑی کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ شام کے چار بجے کے قریب بابا صاحب نہایت پھُرتی کے ساتھ اُٹھے اور باہر نکل آئے۔ گویا انہیں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ علاوہ ان دانتوں کے نشان کے جو انگوٹھے کے نیچے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ آپ کو بہت غصّہ آیا اور فرمانے لگے کہ اس بدتمیز کے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ کوئی تین مہینہ کے بعد گرمیوں کے شروع میں صبح کے وقت جب ضروریات سے فارغ ہو کر واپس تشریف لا رہے تھے تو کیا دیکھا کہ ایک چھ فٹ کا لمبا کالا ناگ جھونپڑی کے برابر لیٹا ہوا ہے۔ اور چیونٹے اس کے

منہ پر چمٹے ہوئے تھے۔ باباصاحب نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا "تو ہے آپ ہی مرگیا" اور لوگوں کو بلوا کر اسے جلوا دیا۔

عاشقانِ دین کے رمز کو سمجھنا اور ان کے بھید کا پانا بہت ہی دشوار ہے۔ کیا حق نے سانپ کو اس لئے بھیجا اور کٹوایا کہ دیکھیں میرے عاشق کی توجہّ موت کی طرف جاتی ہے جو سامنے کھڑی ہے یا مجھ سے وابستہ رہتی ہے۔ اور یہ کہ اس کی نگاہ اسباب پر جاتی ہے یا مسبب الاسباب پر۔ عاشق کو کن کن سخت آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آزمائش کی ضرورت کیا تھی۔ کیا حق کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میرا کون سا بندہ کس حالت میں کیا کرے گا اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ پھر باباصاحب کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ کیا تربیت تھی؟

روح کی نشوونما کے لئے جسم کی تکلیف اور مصیبتیں ضروری ہیں۔ جب بچہّ پیدا ہوتا ہے تو ماں پر قیامت گزرتی ہے۔ تسلسل نسلِ فطرت کا عظیم ترین ارادہ ہے جس کی حفاظت کے لئے فطرت کیا کیا تدبیریں کرتی ہے مگر ان تمام تدبیروں کے باوجود جب ایک نئی جان وجود میں آتی ہے تو وہ منظر قیامت خیز ہوتا ہے۔ ہر جاندار خوشی اور راحت کی طرف دوڑتا ہے۔ گویا خوشی اور حیات

ہم معنی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ غم والم اور یہ اذیت کیسی۔ نہیں نہیں۔ خوشی اور ہنسی تو بلبلے ہیں جو سطحِ آب پر نظر آتے ہیں۔ مٹی کی آنکھیں رازِ حیات کی سطح سے نیچے نہیں دیکھ سکتیں۔ غم اور صرف غم ہی کے ذریعہ انسان اپنی گہرائیوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ دنیا کا غم نہیں، دنیا کا غم دنیا کی خوشی کی طرح ایک پرچھائیں اور آنی جانی چیز ہے۔ نہ اسے دوام ہے نہ قیام۔ وہ غم جس کے متعلق مولانا روم نے فرمایا ہے۔

از نیستاں چوں مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

(جب سے مجھے لے کے جنگل سے کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہے
نالہ و فغاں سے مرد و زن روتے ہیں)

یہ غم ایک سمندر ہے۔ اس میں ڈوب کر انسان اپنی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ حسنِ مجرد نے عالم کی تخلیق کی اور دیکھا تو ہر طرف حسن ہی حسن تھا۔ مگر یہ کائنات رب ذوالجلال کے شایانِ شان نہ تھی۔ اسی لئے آدم کی تخلیق کی۔ بات یوں بھی تھی کہ حسن کی یہ صفت ہے کہ وہ صرف اپنے ہی آپ کو دیکھے۔ گو اسے فطرت نے عالم کا آئینہ بنایا۔ پھر بھی یہ حسن رب ذوالجلال کی عکاسی نہ کر سکا

آدم نے اَلَستُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں بَلٰی کہہ کر بڑا ظلم کیا۔ خالقِ کُل نے آدم کی طرف دیکھا تو وہ اپنے ہی حُسن پر فریفتہ ہوگیا۔ اور اُس نے معشوق کو ایک ایسی شے تحفہ میں پیش کرنی چاہی جو اپنی شایانِ شان ہو۔ یہ شے کائنات کی کسی چیز میں نہ تھی۔ مگر انسان کے قلب میں موجود تھی۔ وہ اس سے بیخبر تھا۔ اس شے کو قدرت نے سنوار کر اور سجا کر آدم کے سامنے پیش کیا۔ آدم نے جب اسے بے نقاب دیکھا تو اس میں غم تھا، وہ چیخ اُٹھا۔

آسمان بارِ امانت نہ توانست کشید

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

(آسمان خدا کی امانت کے بوجھ کو نہ اُٹھا سکا تو مجھ دیوانے (انسان) کے نام یہ قرعہ نکلا (اور مجھے یہ امانت سونپ دی گئی)

اس یار کے چاہنے والوں کو اس یار کی کچھ پہچان نہیں
وہ آنکھ نہیں جو دیکھ سکے، انسان تو ہے انسان نہیں

بیکار ہے بھگتوں کی پوجا اور بدھی مان کی سب سکھشا
وہ وید قرآن کا بھید نہیں وہ دھرم نہیں ایمان نہیں

کچھ دور کی کوڑی لاتے ہیں کچھ اونچے محل اٹھاتے ہیں
وہ من کٹیا میں بیٹھا ہے کچھ ساز نہیں سامان نہیں

کچھ اس میں اس کو ڈھونڈتے ہیں کچھ اس سے باہر ڈھونڈتے ہیں
وہ اندر باہر ظاہر ہے وہ جسم نہیں وہ جان نہیں

جو دیا جوت جگاتے ہیں اور دن کو رات بناتے ہیں
ان سورج دیکھنے والوں کو اس سورج کا کچھ گیان نہیں

بے انت کو انت کہاں پائیے بے انت سے انت کہاں جائیے
سب پریم کی لیلا لیلا ہے وہ رام نہیں رحمٰن نہیں

جو ہر کو سیس نواتے ہیں اور ہر ہی کے ہو جاتے ہیں
وہ ہر میں ہر کو پاتے ہیں ہر پنڈت جی کا مان نہیں

(رحمٰن بابا)

باب ۷

طوفانِ عظیم

قلبِ عاشق جب ہر قسم کی خواہشات اور خیالات سے پاک ہو جاتا ہے تو آئینہ بن جاتا ہے جس کو ایک بلندی بھی محسوس کرنے لگتا ہے اور مستقبل کی عکاسی کرنے لگتا ہے۔ اس قسم کی خبر خوابوں اور بشارتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ ہر بات بالمشافہ ہوتی ہے۔ مگر دل کی صفائی کے باوجود جب تک یقین کی قوت اس میں نہ ہو اور اندر غوطہ لگانے کا راستہ معلوم نہ ہو اس وقت تک ایسی باتیں دُھندلی دُھندلی معلوم ہوتی ہیں۔ دل کا آئینہ جب پوری طرح مجلّا ہو جاتا ہے تو ساری کائنات کے زیر و بم کا ترجمان بن کر اس کی عکاسی کرنے لگتا ہے۔ دل کا آئینہ چونکہ اپنا ہی ہوتا ہے اس لئے جہاں وہ فروغ زندگی کے بے پایاں ابھار کی ایک لطیف لذّت اور بے لوث خوشی محسوس کرتا ہے وہاں ساری دنیا کے دُکھ درد کو بھی اپنے میں سمو لیتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ یہ آئینہ قدرت کے اس ارادہ اور مشیّت کی بھی عکاسی کرتا ہے جس نے لفظ "کُن" کی شکل اختیار کر کے عالم کو وجود کی شکل دی تھی۔ یہی آئینہ جب مکمّل ہو جاتا ہے اور بیچ میں کوئی پردہ باقی نہیں رہتا تو پھر ایک ہو جاتا ہے اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو پھر عالم اسی کے سارے حالات کا آئینہ بن جاتا ہے۔ عاشقی و معشوقی کے عجیب رموز و اسرار ہیں۔ جب دوئی مٹ جاتی ہے تو عاشق و معشوق کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ اس شانِ یکتائی میں سارا عالم اس فرد کی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے اور اس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ لفظ کُن کی خاصیت رکھتا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

(اس کا کہنا خدا کا کہنا ہوتا ہے حالانکہ وہ قول خدا کے
بندے کے حلق سے نکلا ہوتا ہے)

عالمِ اسباب میں تو ایک چیز دوسری چیز سے بنتی ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ قایم ہے۔ مگر اس مقام پر ہر چیز اور ہر واقعہ عدم سے خود وجود میں آجاتا ہے اور نفی سے اثبات خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی وجہ کی ضرورت ہوتی ہے

نہ کسی سامان کی۔

باطن سے اٹھنے والے طوفان کی کون عکاسی کرتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ بڑی بڑی جنگیں، زلزلے، طغیانیاں اور اسی طرح کے واقعات کسی نہ کسی فرد کے باطن کے عکس ہوں۔ ایسے فرد کے جو مرکزِ حق ہو چکا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ ملّتوں اور قوموں کا فروغ اور نشو ونما بھی کسی مردِ حق آگاہ کے قلب کی کیفیات کے عکس ہوں۔ ہر برگزیدہ ہستی کی زندگی میں ایک یا دو ایسے نازک وقت ضرور آتے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اس کی زندگی ایک پلٹا کھاتی ہے اور اس کی حیات کا ایک نیا باب شروع ہو جاتا ہے۔

جس طرح بطنِ مادر میں نو مہینے پرورش پا کر جب بچّہ اس روشنی کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو خون سے پرورش کرنے والی ماں کو ایک قیامت خیز طوفانی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب کسی برگزیدہ ہستی کی منزل ختم ہو جاتی ہے تو ماحول جس نے اپنے گہوارے میں جھلا جھلا کر اسے پالا اور اپنی رنگینیوں کے گیت گا گا کر پوسا تھا۔ اس کی جدائی سے تڑپ اٹھتا ہے اور اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔

کتنا مشکل اور اہم سوال ہے کہ منزل کا مسافر اپنے ارادے اور مرضی سے قدم اٹھاتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ مشیت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں پھینکا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام کو محترم زلیخا کی تہمت پر جب جیل خانے بھیجا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب دار کی سزا دی گئی، اور حضرت شمس تبریزؒ کی جب کھال کھینچی گئی تو اس کی تہہ میں کون تھا اور یہ کس کی کارفرمائی تھی۔ یہ سب بڑے نازک معاملات ہیں۔

جن ہستیوں سے رب العزّت کو کچھ کام لینا ہوتا ہے ان کو ایسے حالات کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے اور اس منزل کے طے کرنے کے بعد بھی جسم کا خول ان کے بسیرے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے یعنی مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (موت سے پہلے مر جاؤ) کے بعد حیاتِ جاودانی عطا ہوتی ہے اور وہ فانی جسم میں رہتے ہوئے اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان میں وہ جن کو عالمِ مثال میں کچھ کرنا نہیں ہوتا پسِ پردہ مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ منزل ایسی ہوتی ہے جس کے راستہ کو طے کرنے کے لئے روحِ انسانی کو لازمی طور پر اس جسم کے بندھن سے سبکدوش ہونا پڑتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صدیوں میں ایک ایسی ہستی بھی عالمِ وجود

میں آتی ہے جو زمان و مکان سے آزاد ہو چکنے پر بھی اس مٹی کے جسم میں رہنا پسند کرتی ہے۔ یہ مقامِ عبودیت ہے اور تکمیلِ انسانی کا آخری مقام۔ یہ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا عطیہ اور خالقِ کائنات کا انسانیت پر آخری اکرام ہے۔ یہ وہ احسان ہے جس کی ابتدا الست بربکم سے ہوتی اور انتہا میں اس نے عرشِ اعظم پر قاب قوسین کی شکل اختیار کی۔ سرورِ کائنات صلعم کا ارشاد ہے کہ میری اُمّت کے افراد بنی اسرائیل کے نبیوں کے برابر ہوں گے اور ان پر فوقیت بھی رکھیں گے۔ یہ بنا بنایا لقمہ، یہ پکی پکائی روٹی اسی نبی اُمّی عربی کی رحمتوں کا باطنی صدقہ ہے جس کا فیضان سینہ بسینہ چلا آ رہا ہے۔

سن ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے بارش کا موسم تھا۔ کئی دن سے فضا میں سکوت اور ایسی ہیبت طاری تھی کہ مچھیرے اور گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی یہ کہہ رہے تھے کہ کوئی زبردست طوفان آنے والا ہے۔ ایک دن نوعمر بابا صاحب گھٹنوں میں سر دبائے خدا جانے کس عالم میں غرق بیٹھے تھے کہ بے ساختہ رحمان خاں کو آواز دی جیسے بہت ہی عجلت ہو اور ان سے کہا کہ تم لوگ فوراً گھر چلے جاؤ۔ ایک زبردست طوفان آنے والا ہے۔ یہ جو کالا کمبل پڑا ہے اسے خوب اچھی طرح میرے گرد لپیٹ کر پیروں کے نیچے دبا دو۔

رحمن خاں اور دوسرے خادموں نے بہت اصرار کیا کہ آپ کو چھوڑ کر ہم کیسے جائیں۔ آپ کا کیا حال ہوگا۔ مگر بابا صاحب نے سخت حاکمانہ لہجے میں ان سے فرمایا کہ جیسا کہا گیا ہے ویسا کرو اور زیادہ باتیں نہ کرو۔ حکم تھا، کس کی مجال تھی کہ اس میں دخل دیتا۔ بابا صاحب کو کمبل لپیٹ کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے رات کیا تھی قیامت تھی۔ ایسا طوفان۔ اس گردو نواح کے لوگ کہتے ہیں کہ کبھی نہ آیا تھا۔ ایسی موسلا دھار بارش تھی، جیسے آسمان کے کواڑ کھل گئے ہوں۔ ایسی تیز ہوا تھی کہ آس پاس کی پہاڑیاں بھی ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ کر گھسٹتے ہوئے اپنے ساتھ اونچے مکانوں کو تباہ کرنے لگے تھے۔ کچے مکانوں کا تو کیا ذکر، وہ تو جیسے تھے ہی نہیں اور کھپریل کے مکانوں کی چھتیں اُڑ اُڑ کر کہیں سے کہیں جا پہنچیں۔ راجہ کا قلعہ اور اس کے سنگین محلّات لرزنے لگے اور ان کے کواڑ اپنے کُنڈے توڑ توڑ کر کہیں سے کہیں جا گرے۔ جو عالم باہر تھا وہی مکانوں کے اندر۔ پانی ہر گوشہ میں اپنا جوش دکھا رہا تھا، کہیں جائے پناہ نہ تھی۔ آدمی تو دیواروں کی آڑ میں کہیں نہ کہیں اپنی حفاظت کر رہے تھے مگر بیچارے مویشی تھے کہ طوفان کے ساتھ بہے چلے جا رہے تھے۔

اور نہ جانے کہاں کہاں ٹکریں کھا کھا کر ختم ہو رہے تھے۔ پرند اس طرح درختوں اور دیواروں سے ٹکریں کھا کر زمین پر گر رہے تھے جیسے کسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے۔ وہ رات کیا تھی، گویا قیامت تھی۔ بوڑھوں نے خدا کی پناہ مانگی اور اس کو یاد کیا اور جوان اپنی اپنی کارسازیوں اور تدبیروں میں مشغول رہے۔ جنگل میں چٹانوں پر تن تنہا چھوٹی سی پھونس کی جھونپڑی میں اللہ کا ایک بندہ سر بہ زانو کالی کمبلی میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ اس پر جو گزری اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

مخلوق پریشان تھی۔ مائیں بچوں کو سینہ سے لگائے جہاں دیوار کا سہارا مل گیا دھڑکتے دلوں اللہ اللہ کرنے بیٹھ گئیں۔ بچے سراسیمہ، جوان بدحال اور بوڑھے اللہ اللہ اور رام رام کا وِرد کر رہے تھے۔ نفسی نفسی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ اس فقیر کی جو جنگل میں تھا کون فکر کرتا۔ عیش و آرام کے دن چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں مگر مصیبت کا ایک ایک لمحہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ساکن ہو گیا اور یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ اس شدت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر یہ وقت گزرا ہو اور وہ بھی اسی وقت تک جب تک کہ وہ واقعہ گزرتا ہے۔ بعد میں

آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ صرف ایک دھندلا سا خیال ہی باقی رہ جاتا ہے۔ دنیا والے وقت کو گھڑیال، آفتاب کے طلوع و غروب اور موسموں کے آنے جانے سے ناپتے ہیں مگر عاشق وقت کو دل کی دھڑکنوں سے، قلب کے اضطراب اور اپنی متحیر آنکھوں کے سکوت سے ناپتا ہے۔

محشر بد امن رات جوں توں کٹ ہی گئی۔ صبح ہوئی تو نہ وہ شور تھا نہ وہ طوفان۔ سورج مسکراتا ہوا اپنی کرنوں کا سونا تقسیم کر رہا تھا اور اس کی پیشانی پر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پسینہ کے ننھے ننھے قطرات جمے ہیں اور وہ کسی سخت محنت کے بعد تھک سا گیا ہے۔ زمین کا برا حال تھا۔ جنگل کے درخت اور ان درختوں پر کچھ سانپ لپٹے ہوئے کچھ مردہ کچھ زندہ اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔ ہر قسم کے جانوروں کی لاشیں جھاڑیوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ آپس میں اس طرح خلط ملط تھے کہ جیسے کسی مصوّر نے تختی پر کوئی حسین منظر بنانے کے بعد ہاتھ پھیر دیا ہو۔ دریاؤں پر جو بڑے بڑے پختہ پُل بنے ہوئے تھے، ان کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

رحمٰن خاں صاحب اور ان کے ساتھیوں کو فکر ہوئی کہ

نہ جانے بابا صاحب زندہ ہیں یا مر گئے۔ وہ بیوی بچوں کے لئے کچھ انتظام کر کے چند ساتھیوں کو لے کر بابا صاحب کی جھونپڑی کی طرف بھاگے۔ بابا صاحب تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ نہ کوئی سڑک اور نہ ہی کوئی پگ ڈنڈی۔ اور جو راستہ تھا بھی وہ جنگل کے جھاڑ جھنڈ سے پٹا پڑا تھا۔ مگر ایک جذبہ تھا جو اُن لوگوں کو لئے جا رہا تھا اور منزل پر وہی پہنچتے ہیں جن کا جذبہ صادق ہوتا ہے۔ آخر یہ لوگ وہاں پہنچ ہی گئے۔ دیکھا تو چٹان تو نظر آ رہی تھی مگر جھونپڑی کا پتہ نہیں۔ البتہ چٹان پر کوئی کالی کالی سی گٹھری ضرور نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کے دل دھڑکنے لگے کہ کہیں بابا صاحب ختم تو نہیں ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ جس طرح سے انہیں چھوڑ کر گئے تھے ویسے ہی اس کمبل میں لپٹے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ بھی سمجھدار تھے۔ اس ڈر کے مارے کہ اللہ جانے زندہ ہیں تو کس حال میں ہیں اور کس عالم میں ہیں۔ ان لوگوں کی ہمّت نہ ہوئی کہ قریب جا کر انہیں ہلا کر دیکھیں۔ آس پاس جو بھی سوکھی لکڑیاں ملیں ان کو جمع کر کے انہوں نے بابا صاحب کے آگے آگ جلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اچھی خاصی آگ روشن ہو گئی تو اس میں

اور بہت سی بڑی بڑی لکڑیاں ڈال دیں۔ اب قدِ آدم شعلے بھڑکنے لگے مگر اس کمبل کی گٹھڑی میں نہ کوئی حرکت پیدا ہوئی نہ کوئی جنبش۔ ان لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔

محبت کا رشتہ تھا، اور خدمت کا لگاؤ۔ دل یہ کیسے تسلیم کرے کہ "ختم فسانہ ہوگیا"۔ یہ لوگ اور قریب پہنچے اور پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر شور مچانے لگے۔ پھر اس وارفتگی کے بعد شدید غم، یاس اور حسرت کے ساتھ یہ لوگ خاموش ہوگئے اور گٹھڑی کی طرف تکنے لگے کہ اس میں کوئی حرکت تو نہیں ہوئی۔ چند منٹ کے بعد گٹھڑی میں سے ایک گہری آواز نکلی "باباہ"۔ وہ بابا کی آواز تھی یا ایک آہ تھی۔ ان لوگوں کے دل باغ باغ ہوگئے۔ زبان سے نکلا خدا کا شکر ہے باباصاحب زندہ ہیں۔ اب یہ لوگ قریب ہوگئے اور کمبلی کھولی جو برف کی طرح ٹھنڈی تھی اس میں باباصاحب سر بہ زانو ہاتھ گھٹنوں سے لپیٹے ہوئے اسی طرح بیٹھے تھے جس طرح یہ لوگ چھوڑ کر گئے تھے۔ سارا جسم لکڑی کی طرح سخت ہوگیا تھا۔ ان لوگوں نے اٹھانے کی کوشش کی مگر گردن سخت ہوگئی تھی۔ البتہ پیشانی گرم تھی اور اس پر پسینہ کے قطرے تھے۔ جلدی جلدی ایک شخص گھر گیا اور چائے کا

سامان لایا۔ اس وقفہ میں جتنے بھی لوگ وہاں آگئے تھے اپنے ہاتھ سینک سینک کر بابا صاحب کو گرمی پہنچانے لگے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد بابا صاحب کے جسم میں گرمی آگئی اور آپ کا عضو عضو کھلنے لگا۔ بالآخر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں آپ کا بدن اس قابل ہو گیا کہ لوگوں نے آپ کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ آپ نے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی اور چائے نوش فرمائی۔ اس وقت بابا صاحب کے چہرے پر بالکل اسی طرح مسکراہٹ تھی جیسی صبح کے سورج کے چہرے پر تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی اسی طرح تھے جیسے تھکے ہوئے ہوں۔

باطن کے بھید کون پائے اور اس سمندر کی گہرائی کا اندازہ کون لگائے۔ طوفانی رات میں دنیا پر جو گزری وہ تو سب نے دیکھا اور جو بابا صاحب کے خاکی جسم پر گزری وہ بھی کچھ ایسی ہی ہو گی جیسے اوروں پر بیتی، مگر اندر کیا ہو رہا تھا اور مشیت کا وہ کون سا ارادہ تھا جو ایک کوہِ آتش فشاں کی طرح شعلہ زن تھا بظاہر دیکھنے کو دنیا وہی تھی اور بابا صاحب بھی وہی تھے مگر ہو کیا گیا تھا۔ اسے کون بتائے اور کیسے بتائے۔ جب فنا کی منزلیں پہلے ہی سے طے ہو گئی ہوں تو پھر یہ فنا در فنا کیا بات تھی، اور

فنا ہوتی کن چیزوں کو ہے۔ رازِ حیات کیا ہے۔ کیا موتو قبل ان تموتو بھی کوئی منزل ہے اور جسمانی زندگی میں کیا اس کا بھی کوئی نازک مقام ہے۔ جو خوش نصیب انسانوں کو اس قسم کی فنا سے میسّر آتا ہے۔ سب کچھ سہی مگر

ع فنا کیسی بقا کیسی جب اُس کے آشنا ٹھہرے

۱۹۵۱ء کی بات ہے، ایک دن ایک خادم نے بابا صاحب سے پوچھا کہ مریدی کیا چیز ہے تو بابا صاحب نے فرمایا "تم نے کبھی قلمی آموں کے پیڑوں کی پرورش ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ ایک آم کی ایک گٹھلی لی جاتی ہے چاہے وہ کسی قسم کے آم کی ہو آم کہلاتی ہے۔ اس کو ایک گملے میں دبا دیا جاتا ہے۔ جب پودا سال دو سال میں ہاتھ بھر کا ہو جاتا ہے تو کسی قلمی درخت میں چاہے وہ درخت سورن ریکھا کا ہو یا امام پسند کا ہو لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے پودے کے نازک سے جسم میں چاقو سے شگاف کیا جاتا ہے۔ اس کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور آنسو بھی نکلتے ہیں ایسا ہی شگاف اس درخت کی شاخ میں بھی کیا جاتا ہے اور ان دونوں کے شگاف زدہ حصّوں کو آپس میں ملا کر کپڑے کی دھجی سے باندھ دیا جاتا ہے اور تھوڑی سی مٹی لگا کر پھر اس کو

روزانہ پانی سے تر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس درخت کے سایہ میں عرصہ تک وہ پودا رہتا ہے اور جب قلم بند شاخ میں دو نئے پتے نکل آتے ہیں تو پھر درخت سے جو پیوست تھا اس کو قلم کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت گملے والے پیڑ کو تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی مگر اس قلمی درخت کو تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جیسے اس کی کوئی انگلی کٹ گئی ہو۔ پھر گملے کو نیچے اتار کر اس درخت کے سایہ میں کہیں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس گملے میں اب دو شاخیں ہوتی ہیں۔ ایک اپنے تخم کی اور ایک اپنے سلسلہ کی۔ "میں" اور "تو" کی کشمکش ہوتی ہے۔ مالی کی توجّہ شاملِ حال ہوتی ہے تو اصلی تخمی شاخ کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے اور گملے میں صرف قلمی شاخ کی پتیاں رہ جاتی ہیں۔ اب اس پودے کو کوئی تخمی نہیں کہے گا۔ وہ تو قلمی ہی کہلائے گا۔ چاہے وہ سورن ریکا کا ہو یا نازک بدن کا۔ اگر مالی کا تصرف اس گملے تک نہیں پہنچا تو دو شاخوں میں سے قلمی شاخ سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے اور وہ پودا جیسا تھا ویسا ہی تخمی کا تخمی رہ جاتا ہے۔ ایسا پودا اگر زمین میں جڑ پکڑ بھی لے تو دانت کھٹے کر دینے والا آم، محض گٹھلی اور پوست۔ ریشہ ہی ریشہ، نہ خوشبو نہ رس۔ اور اگر قلمی پیڑ سے

کام لینا ہوتا ہے تو مالی تخمی شاخ کو قلم کر دیتا ہے۔ اب "تو ہی تو" یا یوں کہیئے کہ اللہ ھُو باقی رہ جاتا ہے۔ اب اس گملے کو شفقت کے سائے سے ہٹا کر اور گملے کو توڑ کر مٹی سے مٹی ملا دی جاتی ہے یہ گویا مرید کا قیام ہو گیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ دھوپ کی تیزی اور طوفانی حوادثات اسے جھیلنے پڑتے ہیں اور وہ تو ہی تو۔ اللہ ھُو کی غذا کھاتے ہوئے سورج کی روشنی، مٹی کی طاقت، زندگی کی طاقتوں اور بارش کے فیضان سے ترو تازگی حاصل کرتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جو مالی دور اندیش ہوتے ہیں دو چار فصلوں کے پھول بھی جھاڑ لیتے ہیں کہ پھل نہ آئیں کیونکہ اس نو عمری کے پھل پھیکے ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ جب یہ درخت کافی سایہ دار ہوتے ہے اور اس میں فطرت کے غیر معمولی حوادثات کو برداشت کرنے کی طاقت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو اسے دیکھ کر مالی اور باغ کا مالک دونوں خوش ہوتے ہیں کہ یہ میرے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے۔ خوب پھل دیتا ہے، دیکھنے میں حسین، چکھنے میں لذیذ، نہایت لطیف اور خوشبو دار۔ اس کے آم ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ہضم کرنا ضرور دشوار ہوتا ہے مگر ہوتے ہیں نہایت صحت بخش اور طاقتور۔ یہ ہے مریدی۔ لیکن پیری کیا چیز ہے یہ بھی کبھی بتلاؤں گا۔"

کیا وہ طوفانی رات وہی رات تھی جبکہ "لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ"
(نہ کوئی اس کا باپ ہے نہ بیٹا) نے گملے کو اپنے آپ سے جدا کر کے
اپنے ہی سائے میں رکھ دیا تھا۔ کیا وہ رات وہی رات تھی
جب بطنِ مادر سے دنیا کی روشنی میں شور اور ہنگامے کے ساتھ
ایک عظیم ہستی آئی تھی۔ کیا وہ رات وہی رات تھی جب ایک
قدوسی ہستی کی روح اس چھوٹے سے جسم میں رہتے ہوئے
مکان و زمان کی آہنی زنجیروں کو ختم کر چکی تھی۔ کیا وہ رات
وہی رات تھی جب بجائے اس کے کہ آسمان کا سورج اس
زمین کو زندگی بخشے۔ اس ہستی کے قلب کا سورج آسمان کے سورج
کو نور و جلال بخش رہا تھا۔ کون آئینہ ہے اور کون آئینہ دار۔ کون دیکھ
رہا ہے اور کس کو دیکھ رہا ہے دیکھنا کس کو کہتے ہیں۔ عشق کیا چیز ہے
عاشق کون اور معشوق کون اللہ اللہ۔ فنا کیسی بقا کیسی۔ جب اس کے آشنا
ٹھیرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس نے کا نالہ تھا جسے اس کی زمین
سے کاٹ کر اس رات جدا کیا گیا تھا تاکہ اس قدوسی زندگی میں قدم
رکھے جس کا نالہ و فغاں ہر خوابیدہ دل کو جگا دیتا ہے۔

از نیستاں چوں مرا ببریدہ اند ؛ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

(جب سے مجھے نیستاں (مرکز) سے کاٹ لائے ہیں۔ اس وقت سے
دنیا بھر میری پکار سے نالاں ہے)

مُکتی راگ

مُوتُو قبل اَن تمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

مرن سے پہلے جو مر جائیں
وجگ میں نروان کو پائیں

امر بنیں اور امر بنائیں
دور رہے ان سے مرتیتہ

مُوتُو قبل اَن تمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

گرو ہی گیان ہے گرو ہی دھیان
گرو کو دیدے جیون دان

کُلُّ مَن عَلَیہَا فَان
الا اللہ، اللہ ھُو

مُوتُو قبل اَن تمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

ذات کا تاج سجائے آیا
روپ کا چھتر لگائے آیا

پریم کی جوت جگائے آیا
جیون گائے تو ہی تو

مُوتُو قبل اَن تمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

زلفوں کی واللیل بنائے مکھڑے میں والشمس دکھائے
نینن سے رحمٰن سنائے صلّ وسلّم اور صلّو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

تم ہو طٰہٰ اور یٰسین انا فتحنا اور طاسین
تم لولاک کے مہ پروین تم ہو ہر کے روبرو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

تم وجہ اللہ تمہاروپ سندر سندر انت انوپ
جیسے اندھیارے میں دھوپ پھلواری میں رنگ و بو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

پریم کے بھید بتائے تم نے ہر کے درشن دکھائے تم نے
بگڑے کاج بنائے تم نے سدھا پرشا ست گرو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

رشی منی بھگوان تم ہی ہو　　گیانی کا سب گیان تم ہی ہو
سارے جگ کا مان تم ہی ہو　　معنی لا تقنطوا
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

سب سنسار کی تم ہو جان　　تن من تم سے کلیان
کل یوم ھو فی شان　　تمرا انت ہے جیو، ہی جیو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

سچے دھرم کی ریت تم ہی ہو　　ہر کے من کی ریت تم ہی ہو
ہارے جگ کی جیت تم ہی ہو　　سارے دکھوں کا دارو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

نس دن روپ نیا دکھلاؤ　　ویاکل چت کا دھیر بندھاؤ
رت رت میں سنگیت سناؤ　　من کی شکتی تن کا لہو
موتو قبل ان تموتو
ولین کی ہے آبرو

(دکھی بابا)

حجرۂ مبارک ۱۹۲۵ء
باب ۸

ایک خادم جو فقیری میں شہنشاہیت کے تماشے دیکھ چکا ہے بیان کرتا ہے کہ بابا قادر کے دربار میں دن کا یہ رنگ تھا کہ گانے ہو رہے ہیں اور قوالیاں۔ یا پھر ایک ہی قطار میں چھوٹے بڑے، امیر و غریب کھڑے ہو کر ایک ایک کر کے بابا صاحب کی زیارت کو آتے ہیں۔ اپنا دکھڑا سنا کے فیضیاب ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اور رات کا رنگ اس سے بھی سوا۔ جب یہ خادم رات کو پڑ کر سو رہتے تو وہ بشارتیں ہوتیں جو برسوں کی چلہ کشی اور گوشہ نشینی سے بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ بس دعا دم ان کا ایسا فیضان تھا کہ اللہ اللہ۔

اسی خادم نے بتایا کہ بابا صاحب ایک بار دربار میں تشریف رکھتے تھے آپ نے ایک دوسرے خادم کو حکم دیا کہ مجھ کو حجرہ دکھا دیا جائے۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ جب دروازہ کھولا گیا اور میں نے حجرہ کے اندر قدم رکھ کر آنکھیں اٹھائیں تو دیواروں پر جگہ جگہ تختیاں سی لگی ہوئی نظر آئیں جن پر عربی خط میں



حجرۂ مبارک

قرآن کریم کی آئیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ تختیاں اس قدر مجلاّ تھیں اور اتنی پُرنور کہ ان کا پڑھنا مشکل تھا۔ یہ منظر عجیب ایک چمک دکھا کر غائب نہیں ہوا بلکہ بڑی دیر تک میری آنکھیں کھلی رہیں اور میرے چاروں طرف یہی منظر رہا۔ اس خادم کے علاوہ بہت سے ہندو اصحاب جو وہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے' بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی یہ منظر دیکھا ہے۔ اس قسم کے مناظر بزرگانِ دین کے چِلّوں کے مقامات میں اکثر خوش نصیب لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے چِلّہ کا حجرہ۔ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب لاہور میں ہے۔ اور اہلِ باطن کے لئے اسی قسم کے مناظر اور مظاہر رکھتا ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ دل کے ذکر کی بازگشت ان دیواروں پر قائم ہو جاتی ہے۔ اور حجرہ کی مٹی کی دیواریں بھی مجلّٰی اور منوّر ہو جاتی ہیں۔ اور جو لوگ صفائے قلب کے ساتھ داخل ہوتے ہیں انہیں یہ منظر دکھائی دے جاتے ہیں۔

اس حجرۂ مبارک کی داستان یوں ہے کہ ۱۹۲۵ء میں خادموں کو یہ خیال آیا کہ اس چٹان پر جھونپڑی کا قائم رہنا دشوار ہے۔ اگر چار کونوں میں پتھر کے اندر سوراخ کر دیئے جائیں اور

ان میں چار کھمبے لگا دیئے جائیں تو جھونپڑی قائم رہ سکتی ہے اس خیال کے تحت آس پاس کی پہاڑیوں پر کام کرنے والے سنگتراشوں کو بلایا گیا اور انہوں نے بخوشی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ جب سوراخ کرنے کا کام ختم ہو گیا تو ان سنگتراشوں نے خود ہی کہا کہ بجائے لکڑی کے کھمبوں کے ہم ان ہی چٹانوں میں پتھر کے چار کھمبے بنا کر لگا دیں گے اور ایسا ہی کیا گیا۔ جب کھمبے لگ گئے تو ان ہی لوگوں نے پتھر کی دیواریں کھڑی کر دیں اور ایک دوسرے شخص نے گنبد نما چھت ڈال دی اور کواڑ لگوا دیئے۔ پھر فرش ہموار کر کے پختہ کرا دیا۔ نہ کوئی نقشہ تھا نہ پیسہ اور نہ ہی کوئی فرمائش و خواہش یہ سب خود بخود ایسے ہی ہوتا گیا جیسے جنگل میں خود بخود پھول نکل آتے ہیں اللہ والوں کے کام کچھ اسی طرح ہوتے ہیں۔

۱۹۳۰ء تک بابا صاحب رات کا وقت اپنے آبائی مکان کے کھلے صحن میں جہاں ایک جھونپڑی ڈال رکھی تھی گزارا کرتے اور دن جنگل کے اسی حجرے میں۔ ۱۹۲۳ء کے طوفانِ عظیم کے بعد سے بابا صاحب کی شہرت بہت تیزی سے پھیل گئی تھی اور یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ فقیر جو کمبل روڈ کے کالے تالاب کے نزدیک چٹانوں پر رہتا ہے مہلک سے مہلک بیماری کا دم بھر میں علاج کر دیتا ہے۔

اس شہرت کی وجہ سے دُور دُور سے لوگ آنے لگے۔ معمول یہ رہتا کہ جب کافی لوگ جمع ہو جاتے تو بابا صاحب کو حجرہ میں اطلاع کر دی جاتی۔ وہ اگر جی چاہتا تو باہر آجاتے اور کسی کو کوئی پتّی دے دیتے۔ کسی کو ایک چٹکی راکھ۔ لوگ اپنی مرضوں کا یہ علاج لے کر خوش خوش واپس لَوٹ جاتے۔ ان ہی لوگوں میں اکثر انگریز حکام اور تجارتی کمپنیوں کے افسر بھی دُور دُور سے آتے اور اپنی مرادیں پا کر لَوٹ جاتے۔

۱۹۳۱ء سے بابا صاحب نے اس حجرۂ مبارک میں مستقل قیام شروع کر دیا اور ان ہی چٹانوں کے نیچے کی طرف تھوڑے سے فاصلہ پر ایک اور جھونپڑی بنائی گئی جس میں کبھی کبھی غسل کے لئے پانی گرم ہوتا تھا۔ یا چائے وغیرہ بنتی تھی۔ اب دو چار خادموں نے بھی یہاں مستقل رہنا شروع کر دیا تھا جن میں قابلِ ذکر مرحوم امام صاحب تنالی والے ہیں اور فرید بابا جو آج کل مچھلی پٹم میں پوری فقیری لئے بیٹھے ہیں۔ یہ خادم لوگ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور جتنا بھی وقت ملتا اس جگہ کے درست کرنے میں صرف کرتے۔ ان لوگوں نے جھاڑ جھنکار کاٹ کر گڑھوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے مٹی سے بھر ڈالا۔ اللہ رے ہمت چٹانوں کے

درمیان کے وہ بڑے بڑے گڑھے جو پندرہ پندرہ بیس بیس فٹ گہرے تھے آج ہموار ہو چکے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں چمڑے کے ایک تاجر دیوالیہ ہو کر بابا صاحب کے پاس آئے اور بابا صاحب کی خدمت میں روزانہ حاضری دینے لگے۔ بابا صاحب ان سے فرما دیا کرتے کہ آج فلاں مال خرید لو اور کسی دن کہتے آج اپنا سب مال فروخت کر دو۔ بظاہر تو یہ روزمرہ کی عقل اور سمجھ کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہ بابا صاحب کا فیض تھا کہ دو تین سال کے اندر وہ تاجر کافی مال دار اور صاحب جائداد ہو گئے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ زائرین کی سہولت کے لئے اگر اجازت ہو تو وہ ایک بڑا چبوترا اور اس پر ایک چھپر ڈلوا دیں۔ بابا صاحب نے اس بات کو منظور کر لیا اور حجرہ مبارک سے متصل زمین ہموار کر کے ساٹھ فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا ایک چبوترا بنا دیا گیا۔ پھر اینٹ کے ستون پر تاڑ کا شہتیر رکھ کر ایک اچھا خاصا محفل خانہ تیار ہو گیا۔ اس کے بعد اور بہت سی پختہ عمارتیں بننے لگیں۔ کچھ لوگوں نے بہت چاہا کہ محفل خانہ کو پختہ کر دیں مگر بابا صاحب نے اس کی منظوری نہیں دی۔ یہاں تک کہ اس فرش کو جو دبیز ریت کا ہے

اسی حالت میں رکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے یہ فرمایا "مٹی کا فرش بیٹھنے کے لیے اور سر پر پتّوں کا سایہ بہت اچھا ہے"۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۸ء تک پورے تئیس ۲۳ سال حجرہ کی یہی حالت دیکھی گئی۔ اس حجرہ کا دروازہ جنوب کی طرف کھُلتا ہے۔ اندر داخل ہوں تو سیدھے ہاتھ کی طرف ایک چارپائی پڑی ہوئی ہے جس کی نواڑ اور دری وہی ہے جو ۱۹۲۵ء میں کسی نے ڈال دی تھی۔ دروازہ کے مقابل شمال کی دیوار سے ملا ہوا ایک لمبا چبوترہ ہے جس کا رُخ مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ چبوترہ اور چارپائی کے درمیان تھوڑی سی جگہ اور ہے جس میں اگر چارپائی ڈال دی جائے تو کمرہ بالکل پُر ہو جاتا ہے۔ بابا صاحب نے تئیس ۲۳ سال کی مدّت کا زیادہ حصّہ اسی چبوترہ پر بیٹھ کر گزارا ہے۔ یا پھر جب بھی مہلت ملی ہے تو حجرہ میں جا بیٹھے ہیں۔ اس حجرہ میں آپ قبلہ رُو ہو کر ہاتھ میں صندل کی تسبیح لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ تسبیح اب اتنی گھس چکی ہے کہ چمکتی ہے۔ سامنے کچھ پھول پڑے رہتے ہیں اور بائیں ہاتھ پر کونے میں عود دان جلتا رہتا ہے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۸ء تک عجب زمانہ گزرا ہے۔ ریاضت کس چیز کو کہتے ہیں۔ اس کا سمجھنا اور سمجھانا بڑا دشوار ہے۔

ظاہری ریاضت تو یہ ہے کہ مٹھی بھر چنے یا ایک پیالی چائے یا اس سے بھی کم پر اکتفا کیا جائے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ سویا نہ جائے اور سارا وقت گوشہ نشین ہو کر ذکر و فکر میں گزارا جائے۔ یہ طریقہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے اور ایسا ہوتا بھی ہے مگر سنا ہے کہ اہلِ باطن کی ریاضت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لکڑی کو لکڑی سے رگڑیئے تو آگ پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح من و تو کی رگڑ سے عشق کی آگ پیدا ہوتی ہے جو شدید سے شدید تر ہوتی ہے۔ عمق و وسعت میں زمین و آسمان کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ پھر کیا تو اور کیا میں۔ اس کے متعلق کوئی کہے بھی تو کیا کہے۔ جب انا الحق کا مدعی حق ہو چکا تھا تو پھر انا الحق میں انا کی دوئی کیا معنی ؟

بابا صاحب کے تیئس سال اسی مَیں اور تُو کی کشمکش میں گزرے۔ اللہ اللہ پورے تیئیس سال جبکہ اس قسم کی زندگی کا ہر دن قیامت کے دن سے کم نہیں اور قیامت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہو گا۔ جن پر یہ مصیبت پڑتی ہے وہی جانتے ہیں کہ اس قسم کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر کیسے ہو جاتا ہے۔ اور وہی اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ

اس میں نہ کوئی مبالغہ ہے نہ شاعری۔ اس قسم کی زندگی کا ہر سانس ایک شعلہ جوالہ ہوتا ہے اور ہر سانس کی آمد و رفت کا سفر سورج کے طلوع و غروب کی طرح ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا فرمان ہے اُذْکُرُوا اللّٰہَ اَشَدَّ (شدت سے اللہ کا ذکر کرو) ذکر کسے کہتے ہیں اور شدت کیا ہوتی ہے۔ یہ کوئی سوختہ دل ہی بتا سکتا ہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ فقیر جب ذکر کی شدت میں مشغول ہوتا ہے تو اس کی سانس سے جلے ہوئے گوشت کی بُو آتی ہے۔ کوئی اپنی ایک اُنگلی کو جو جسم کا ایک ادنیٰ حصّہ ہے ایک منٹ کے لئے بھی معمولی آگ میں ڈال کر یہ حال معلوم کر سکتا ہے کہ جلنا کسے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ تو دنیا کی آگ کی بات ہے جو پھیکی آگ ہوتی ہے اور دوزخ کی آگ کو ستّر ہزار دفعہ ٹھنڈا کرنے کے بعد دُنیا میں لائی گئی ہے۔ اب اس شدّت کو کوئی کیسے بتائے جس کے ساتھ عاشقوں کا ذکر ہوتا ہے اور اُس ریاضت کو کوئی کیسے سمجھائے جو وہ کرتے ہیں۔ ہندو دھرم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وشوامتر نے سولہ ہزار سال تک تپسّیا کی تھی۔ دن اور رات کے پیمانے سے ناپیں تو ممکن ہے کہ سولہ ہی سال گزرے ہوں لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ دل پر اس کیفیت کے

سولہ ہزار سال گزر رہے تو غلط نہ ہو گا۔ دنیا والے کہتے ہیں کہ ہم جو دیکھتے ہیں وہی سچ ہے۔ دین والے کہتے ہیں کہ اصل حقیقت دل کی دنیا ہے۔ باطن کا بھید اہلِ باطن ہی پا سکتے ہیں۔ مٹی کی آنکھوں والا اس کو کیا دیکھے۔

اسی ذکر و فکر کی شدّت کے زمانہ میں بابا صاحب قبلہ اکثر صبح کے وقت جنگلوں میں نکل جاتے تھے۔ یہ جنگل موجودہ قیام گاہ کے شرقی جانب ہے۔ اور اس سے کوئی آدھ میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر سمندر ہے۔ یہ پہاڑیاں بھی بڑی دلچسپ ہیں۔ ان میں گھنے جنگل اور مشکل راستے ہیں۔ جنگلی جانور تو اب کم ہیں مگر سانپوں کا اب بھی وہی حال ہے۔ کافی چڑھائی پر ان ہی پہاڑیوں کے دامن میں ایک عجیب اور دلکش قدرتی جگہ ہے۔ جس کی پشت پر اور دائیں بائیں اونچی پہاڑیاں ہیں اور سامنے یعنی جانبِ شمال دور تک ایک کھلا ہوا میدان۔ اس میدان میں دور تک تاڑ کے درخت ہیں جن کے پتّوں کی چھت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی حسین سبزہ زار۔ اسی جگہ ایک چٹان پر کوئی تین فٹ اونچا، تین فٹ لمبا، تین فٹ چوڑا بالکل چورس سیاہ پتھر

کا ایک مکعب رکھا ہوا ہے جو خوبصورتی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سنگتراش نے اپنے فن کی یادگار بنائی ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب برسوں بابا صاحب تن تنہا اسی مکعب پتھر پر بیٹھ کر سر بزانو اللہ اللہ کیا کرتے تھے۔ خواہ گرمی ہو یا جاڑا۔ دن ہو یا رات عام طور پر سورج جو سمندر کی جانب سے نکلتا اپنی ساری تیزی بابا صاحب کے سر پر صرف کرتا تھا۔ رب ذوالجلال کے کرم کا متحمل ہونے والا ظرف بھی مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ چاندنی راتیں اور ساحلِ سمندر کا چاند کتنا پیارا اور کتنا حسین ہوتا ہے۔ اس نظارہ کا کوئی پاک باطن ہی صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ چاند بھی طلوع ہوتا اور بابا صاحب پر اپنی محبت و شفقت نچھاور کرتا ہوا مغرب کی گود میں منہ چھپا لیتا۔ تاروں بھری راتوں اور سمندر میں ان کے عکس کی جھلملاہٹوں کا دنیا کے قیمتی نگ اور نگینے بھی ہمسری نہیں کر سکتے۔ یہ حسینانِ فلک رات رات بھر بابا صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر حیرت اور محبت سے اپنی آنکھیں مٹکاتے رہتے۔ جب اندھیری راتیں آتیں تو جنگل میں ایک دہشت ہوتی۔ پھر بھی بابا صاحب اپنے اسی مکعب پتھر پر بیٹھے رہتے۔ اس تاریکی میں کبھی سانپوں کی پھنکار ہوتی کبھی درندوں کی قریب ہی سے چمکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ کبھی

ڈراؤنی آوازیں۔ کبھی موت کی سی خاموشی۔ کبھی اس خاموشی میں الّو کی دل ہلا دینے والی چیخ۔ یہ سب تو ظاہر کی دنیا میں تھا۔ لیکن قلب عاشق پر جو گزر رہی تھی وہ کون بیان کر سکتا ہے۔ وہ ماحول اور وقت کے اس اتار چڑھاؤ کے درمیان کس سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ وہ کون سی لاہوتی فضاؤں کو طے کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کون سے عالمِ قدس کو اپنا رہا تھا۔ اور پھر دن ہفتے اور مہینے نہیں بلکہ سال اور سالہا سال جبکہ خود اس کا ہر سانس ایک ہزار سال پر بھاری تھا۔ اللہ اللہ فقیروں کے شغل کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

آج بھی یہ چٹان متبرک مانی جاتی ہے اور زائرین اسے دیکھنے جاتے ہیں۔ اس مکعب پتھر والی چٹان کے سامنے مسجد کے میناروں کی طرح دو تاڑ کے درخت کھڑے ہوئے ہیں جو لوگوں کو دور سے بلاتے ہیں اور بزبانِ حال کہتے ہیں۔ حیّ علی الصّلوٰۃ۔ حیّ علی الفلاح

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حُکمِ اذاں لاالٰہ الا اللہ

موجودہ دربار سے مشرق کی طرف کوئی نصف میل کے فاصلہ پر ایک بہت اونچی پہاڑی ہے جس کے نشیب میں ایک چٹان ہے دور سے دیکھیے تو یہ چٹان اپنی ہی سطح پر نظر آتی ہے۔ مگر وہاں پہنچیے

تومعلوم ہوگا کہ آپ سطح سے کتنے اونچے ہیں۔ اونچے اونچے درختوں کی چوٹیاں اور دور راجہ کے محلات کی چھتیں اور موجودہ تہذیب کی فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھوآں۔ یہ سب آپ کو سطحِ نظر سے بہت نیچے معلوم ہوتے ہیں۔ بابا صاحب اسی زمانہ میں اکثر شام کے وقت اس چٹان پر آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہاں کا منظر حسین ترین منظر ہے۔ بیس تیس میل تک سامنے کھلا میدان ہے اور اس کے آگے کچھ دھندلی نیلگوں پہاڑیاں کہیں ریل کے گزرتے ہوتے انجن کا دھواں اور ایک طرف دریا کا بل کھاتے ہوتے بہنا۔ پھر غروب آفتاب کا سماں جیسے کسی قوم کے درد رکھنے والے کی غمگین آنکھ جھپک گئی ہو۔

آج کل بھی بابا صاحب ان زائرین کو جن کی قسمت میں کچھ ہوتا ہے لے کر اس چٹان پر سیر کے لئے تشریف لیجاتے ہیں۔ چٹان پر چڑھنے سے پہلے احتراماً لوگ جوتے اتار دیتے ہیں اور اس پر بیٹھ کر خاموشی سے ظاہر و باطن کی سیر کرتے ہیں۔ نمعلوم کیوں دو ایک خادم چٹان کے نیچے آس پاس سے جھاڑ جھنکاڑ فراہم کر کے آگ جلا دیتے ہیں۔ جو خوب بھڑکتی ہے۔ اس چٹان پر بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق کی تلاش

کی تاریخ۔ خودی کی جستجو کی تاریخ، رمزِ حیات کی تاریخ۔ سب کچھ دل کی دھڑکنوں کی تال پر رقص کرتی ہوئی اپنی آنکھوں کے آگے گزر رہی ہے۔ حضرت آدمؑ کی توبہ۔ حضرت نوحؑ کا طوفان، حضرت زکریا علیہ السلام کا درخت میں سما کر آرہ سے چیرا جانا۔ حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ کی تاریکی میں لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (کوئی معبود نہیں سوائے تیرے۔ تو پاک ہے میں ظالموں میں سے تھا) کہنا۔ حضرت ابراہیمؑ کا کلمہ حق کی تجدید کرنا۔ حضرت داؤدؑ کا لحن اور بالآخر حضرت موسیٰؑ کی رَبِّ اَرِنِیْ کی تکرار۔ یہ سب کچھ آنکھیں نہیں دیکھتیں، مگر اس مقام پر بیٹھنے والوں کے قلوب ان کیفیات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اس چٹان پر سے اترتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے تو گھنٹہ بھر گزرا مگر عمر کی تاریخ کے پچاس ہزار سال بیت گئے اللہ اللہ لوگ درازئ عمر کی دعائیں مانگتے ہیں اور خاص وظائف کے چلّے کھینچتے ہیں مگر

من درویش را کشتی بہ غمزہ
کرم کردی الٰہی زندہ باشی

(مجھ درویش کو ادا سے مارا۔ کرم کیا۔ اے الٰہی تو زندہ رہے)

عبودیت کے تقاضے کے مطابق ہر چڑھائی کے بعد بندہ کو اپنے مقام پر لوٹ آنا پڑتا ہے۔ چٹان سے اترتے ہیں تو بائیں جانب نیچے ایک بہت پرانا اور بہت بڑا راجاؤں کا لگایا ہوا آم کا باغ ہے۔ اہلِ چشت کی پرورش آسمانوں کے تلے سورج کے جلال میں گھنے درختوں کے سائے میں ماہ منیر کے جمال میں اور چشموں کے پانی میں ہوتی ہے جہاں وہ اپنے دل کو حجرہ بنا کر ہمہ اوست کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی تفریق، دین و دنیا کا تضاد اہلِ چشت سب کچھ ایک گھونٹ میں پی جاتے ہیں۔ باغ کی سیر کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر درخت کی ایک تاریخ ہے اور اس کی بھی ایک آپ بیتی، ایک جان، ایک دل، ایک روح ہے۔ اور وہ زبانِ حال سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ مگر ہم سُن نہیں سکتے۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پتّہ پتّہ ذکرِ حق میں لگا ہوا ہے۔ باغ کے نشیب میں ایک کنواں ہے اس سے پانی لیا جاتا ہے۔ لوگ منہ ہاتھ دھو کر تھکن دور کرتے ہیں۔ باغ کی مالن بابا صاحب کے لئے گائے کے تازہ دودھ میں شکر ملا کر چاندی کے گلاس میں پیش کرتی ہے۔ بابا صاحب گلاس سے منہ لگاتے ہیں۔ آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوتی ہیں اور

دو ایک گھونٹ پینے کے بعد جو بھی پاس ہوتا ہے۔ اس کو بخش دیتے ہیں اور قیام گاہ پر لوٹ جاتے ہیں۔

آپ کا حجرہ ایک نشانی ہے۔ ایک دل ہے جس میں حق بستا ہے۔ ماسوا کا یہاں دخل نہیں اور عود کی خوشبو ایک نشانی ہے۔ فیضِ محبت کے رُوپ کی۔ یہاں شک وشبہ کی گنجائش نہیں یہاں تجلّیاں اور کبریائی کارفرما ہیں۔ خودی کیسی، خواہشات کیسی، اپنی کوشش کیسی۔ اپنی صلاحیتیں کیا۔ اپنی دینی طلب اور آرزو کیا۔ یہ سب کچھ ہیچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے حجرۂ مبارک میں قدم رکھا ہے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔

(اے نفسِ مطمئنّہ رجوع ہو اپنے رب کی طرف راضی ہونے والا (رب سے) اور (رب کی) رضا حاصل کیے ہوئے۔ پھر داخل ہو اس کے بندوں میں اور داخل ہو جنّت میں)

نفسِ مطمئنّہ تصوّف کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد مقام عبودیت میں داخل ہوتے ہیں اور "میری جنّت" میں داخل

ہونے کے قابل ہوتے ہیں۔

میں ہوں کہاں تم ہی تو ہو روحِ رواں و جانِ من
بوئے صفات ہو تم ہی جلوۂ شانِ ذُوالمنن
نازشِ بندگی ہو تم تابشِ زندگی ہو تم
عینِ یقین تم ہی تو ہو سِرِّ نہانِ جانِ من
اسم کی اوٹ خوب لی، خوب ہوئی یہ گفتگو
لطفِ کلام تم سے ہے تم ہی ہو معنیٔ سخن
کیف ہے وجہِ درد و شوق کیف ظہورِ کائنات
نغمہ سرا تم ہی تو ہو، صحن صحن، چمن چمن
سوزِ دروں ہو گئی بندشِ روح و قلب و تن
فرقت دبے کلی بنی، صبر و قرارِ جانِ من
دامِ وجود بن گیا حلقۂ زُلفِ پُرشکن
دام میں اپنے آگیا عشوہ طرازِ پُرفتن
اَنْفُسِکُمْ جو کہہ دیا بات عجب سی بن گئی
میں ہوں کہاں تم ہی تو ہو بشکلِ ولی منّ و عن

(ولی اللہ)

ساجن کا تصوّر چھایا ہے پُر نور شراب برستی ہے
اب خواہشِ مینا کون کرے بے جام سرور و مستی ہے
من گیان کی نیاری نگری میں گر دھیان کا نیارا چاند اُبھرا
اس سیلِ نور کی موجوں سے اب شغلِ مے پرستی ہے
کچھ سندر سندر سپنے ہیں کچھ پیاری پیاری باتیں ہیں
وہ جلوے ہیں جن جلووں کو زاہد کی آنکھ ترستی ہے
آغاز نہیں انجام نہیں، یاں تن کا من سے کام نہیں
یاں من موہن کا سایہ ہے، نا موت یہاں نا ہستی ہے
سب دُکھ کی باتیں بھول گئیں سب سکھ شوالے ٹوٹ گئے
ایک تیرے نام کی پوجا سے، یہ دل کی بستی بستی ہے

(رحمٰن بابا)

باب ۹ دربارِ عام

آیئے اب ہم ایک زائر کی حیثیت سے قادر نگر چلیں اور بابا قادر اولیا سے ملاقات کریں جن کے نام نامی پر یہ بستی بسائی گئی ہے۔ وہاں کیا نظر آتا ہے۔ یہ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم خود کیا ہیں اور ہمارا مدعا کیا ہے۔ ریل سے اترنے کے بعد کسی تانگے والے سے کہیئے کہ بابا صاحب کے پاس لے چلو اور وہ آپ کو وجے نگرم شہر کی سڑکوں اور بازاروں سے گزارتے ہوئے شمال مشرقی طرف کوئی دو تین میل کا فاصلہ طے کر کے شہر سے باہر لے آئے گا۔ شہر کافی آباد ہے۔ سڑکوں پر بہت چہل پہل ہے اور زندگی کے کافی آثار نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اگر آپ کے پہلو میں حساس دل ہے تو جی چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس شہر سے باہر نکل جائیں۔ گو اس شہر میں دوسرے جدید شہروں کی طرح کوئی خاص سماجی عیب نہیں ہے جیسے شراب خوری، جوا، سٹہ بازی، زناکاری یا فرقہ بندی وغیرہ۔

وجے نگرم ایک پرانا شہر ہے۔ یہاں کی تہذیب پرانی ہے اور انفرادی حیثیت سے لوگوں میں اب بھی دیرینہ تہذیب باقی ہے۔ اب بھی شہریوں میں وہی فراخدلی اور رواداری نظر آتی ہے جو قدیم شرفاء کا دستور تھا جو فی زمانہ معدوم ہے مگر دلِ بینا کو یہی یقین سے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کی مٹی یہ کہہ رہی ہے کہ کافی عمر ہو چکی ہے، اب جگہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ جب آپ شہر کے شمال مشرقی کونے سے ہو کر نکلیں گے، جہاں کی آبادی غریب مسلمانوں کی ہے تو یہ احساس اور بھی بڑھ جائے گا۔ شہر سے باہر نکلنے کے بعد نہایت عمدہ پکی سڑک اور پہاڑوں کی طرف چڑھائی ہے اور میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر گھنے درختوں میں نصب کئے ہوئے سبز علَم دکھائی دیتے ہیں اور آپ فوراً یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی قادر نگر ہوگا۔ ریلوے اسٹیشن سے بھی کچھ فاصلہ پر ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے جس کی ایک چٹان پر سفیدی کر دی گئی ہے۔ اس پہاڑ کا نام مچاکونڈا (نشانی کا پہاڑ) ہے۔ اب یہ نشانی بہت دور سے نظر آتی ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں قادر نگر ہے۔ یہ جگہ وہی ہے جس کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں ناگ پھنی کے جھنڈ، سانپ، خوفناک درندے، ارواحِ خبیثہ اور

ایک نامعلوم وحشت کی وجہ سے دن کے وقت بھی باہمت لوگ آنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ آج اس جگہ ایک چھوٹا سا گاؤں قادرنگر بسا ہوا ہے۔ اس میں سڑک کے دونوں طرف کچھ پکّے مکانات ہیں اور بہت سی تاڑ پان کی جھونپڑیاں ہیں۔ یہاں ایک پختہ عام مسافر خانہ بھی ہے اور ایک مسجد کی نیو بھی پڑ چکی ہے۔ انہی مکانوں میں مسافر آکر ٹھیرتے ہیں۔ اسی بستی میں چار چھ دکانیں بھی ہیں جن میں کھانے پینے کا سامان بھی ملتا ہے۔ ان مکانوں میں غریب بھی رہتے ہیں اور امیر بھی۔ مگر سارے گاؤں کی فضا غریبانہ اور فقیرانہ معلوم ہوتی ہے۔ امیر لوگ آتے ہیں تو اس فقیروں کی بستی میں وہ بھی فقیرانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

آگے بڑھ کر سیدھے ہاتھ کو مُڑیئے تو گھنے برگد کے درختوں کی ایک قطار لگی ہوئی ہے۔ وہاں سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر بابا صاحب کا حجرۂ مبارک نظر آتا ہے۔ درختوں کے نیچے صاف اور ہموار زمین ہے۔ جہاں پہلے بڑی بڑی چٹانیں اور غار تھے۔

جب کوئی نیا مہمان آتا ہے تو جھونپڑیوں سے عورتیں اور بچّے سر نکال کر دیکھنے لگتے ہیں۔ اور خوشی ان کے چہروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب آپ کسی سے پوچھیں گے کہ بابا صاحب سے

ملاقات کیسے ہو گی تو آپ کو ہر شخص یہ بتائے گا کہ سیدھے ہاتھ پر جو برگد کا درخت ہے اس کے نیچے اوروں کے ساتھ آپ بھی بیٹھ جائیے اور جب بابا صاحب باہر تشریف لے آئیں تو قطار بنا کر ایک ایک کر کے سب کو زیارت ہو جائے گی۔ درخت کے نیچے اور اس کے قریب کی بڑی چٹان پر دو ڈھائی سو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں جن میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گویا یہ چھوٹا سا مجمع حقیقت میں دنیا والوں کی ایک نمائندہ جماعت ہوتا ہے۔ ان میں سادھو بھی ہوتے ہیں، فقیر بھی، ملک التجار بھی اور ان کی بیویاں بھی جو سونے میں لدی ہوئی ریشمی ساڑیوں میں ملبوس زمین پر پالتی مارے بیٹھی ہوتی ہیں اور اس مجمع میں مارواڑی بھی ہوتے ہیں اور چور بازاری کرنے والے سوداگر بھی۔ اگر ایک طرف پنڈت جی مہاراج ماتھے پر قشقہ لگائے، آسن جمائے بیٹھے ہیں، تو دوسری طرف کنگال اور بھکاری بھی ہیں، کوڑھی بھی، جذامی بھی۔ ایک طرف بوڑھا اپاہج ہے جس کے پیر سوکھ کر بدن سے جا ملے ہیں اور اس کی بیوی اس کو کاندھے پر اٹھا کر لاتی ہے تو دوسری طرف ایک جوان لڑکی ہے جو کپڑے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی ہے اور لوگ ڈر کے مارے اس سے دور ہٹ رہے

ہیں۔ اس مجمع میں ایک ریٹائرڈ جج صاحب بھی نظر آ رہے ہیں۔ ایک کسی ضلع کے سول سرجن بھی، کچھ شہر کے طالب علم ہیں اور کچھ مزدور۔ کچھ طوائفیں ہیں اور کچھ دُور دُور سے آئے ہوئے لاولد جوڑے بھی۔ غرض کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے، بھلا یا بُرا، وہ سب کچھ یہاں موجود ہے۔ مسلمان صرف خال خال ہیں یعنی دو چار غریب مرد اور عورتیں جو باہر سے آئے ہیں ورنہ باقی سب دوسری قوموں کے لوگ ہیں۔

درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے پڑھے لکھے لوگ دل ہی دل میں اپنی اپنی باتیں دہراتے رہتے ہیں کہ بابا صاحب سے مجھے یہ کہنا ہے، وہ کہنا ہے۔ اور جو ان پڑھ لوگ ہیں، وہ ایکدوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے رہتے ہیں کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کیسے آئے ہو؟ ابھی لوگ اپنی اپنی آپ بیتی سُنا رہے ہوتے ہیں کہ دفعتاً ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور شور مچتا ہے کہ آ گئے آ گئے ـــــ اور لوگ کھڑے ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ خدّام سب کو بیٹھ جانے کی تاکید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اطمینان سے ملاقات کیجیے، گھبراؤ نہیں۔ لوگ قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدّام ان کے علیحدہ علیحدہ گروہ بنا

دیتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کا الگ، لاولد جوڑوں کا الگ اور ایک ایک جتھے کو محفل خانے کی طرف بھیجنے لگتے ہیں جہاں پر خادم ان کو ایک ایک کر کے اندر داخل کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھ میں کوئی تحفہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کے ہاتھ میں دو اگربتیاں ہوتی ہیں تو کسی کے ہاتھ میں دو کیلے۔ کسی کے پاس تھالی میں ایک ناریل یا آم یا کبوتروں کا دانہ یا لوٹے میں دودھ ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھ میں پھولوں کے چھوٹے اور بڑے ہار ہوتے ہیں۔ کافور کے بھی ہار ہوتے ہیں اور زردوزی کے بھی۔ غرض کہ اپنی اپنی نیّت اور عقیدہ کے مطابق کچھ نہ کچھ نذرانہ ہر شخص ضرور ہی لاتا ہے۔

باباصاحب محفل خانہ کے چبوترے کے بائیں کنارے ایک ستون سے پیٹھ لگا کر پالتی مار کر قبلہ رو بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کے بائیں ہاتھ کی طرف ایک کٹہرا ہوتا ہے جس میں ایک ایک کر کے حاجتمند آتے ہیں۔ آپ کے دائیں طرف ذرا سامنے قوّال بیٹھے ہوتے ہیں اور گانے والی طوائفیں۔ محفل خانہ کا پچھلا حصّہ بالکل خالی رہتا ہے۔ جب لوگ باباصاحب کے سامنے آتے ہیں تو آپ کا ہنستا اور روشن چہرہ دیکھ کر ان کے دُکھ درد



نیاز

دور ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نذر ہوتی ہے۔ ہونٹ کچھ ہلتے ہیں مگر بات منہ سے نہیں نکلتی۔ حال یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، آنسو ضبط و اظہار کے بیچ میں ڈگمگاتے ہیں۔ خادم جو وہاں بیٹھا ہوتا ہے نذر لے لیتا ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں ہار ہوتا ہے تو آپ سے کہتا ہے کہ گلے میں ڈال دو۔ بابا صاحب پوچھتے ہیں" آپ کا کیا نام"۔ آپ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہیں" وینکٹ نرائن"۔ پھر ذرا وقفہ کے بعد" آپ اکیلے آئے ہیں"۔ "جی"۔ "کہاں سے آئے ہیں؟"۔ "میسور سے آیا ہوں"۔ "کس کام کے لئے آئے ہیں؟" "جی آپ پر سب روشن ہے"۔ پھر ایک خفیف سکوت کے بعد خادم کو آواز دیتے ہیں اور حکم ہوتا ہے" آپ کو محفل خانہ کے دائیں بازو میں بٹھا دو"۔ آپ بیٹھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی چٹائی تو پڑی ہوئی نہیں ہے۔ پھر یہ سوچ کر کہ فقیر کے دربار میں زمین ہی کا فرش ہوتا ہے، آپ ستھرے کپڑوں کا خیال دل سے نکال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ادھر ایک طوائف گانا شروع کرتی ہے۔

قادر شاہ مہاتما ہیں
بڑے دھنی اور پرماتما ہیں

آپ میں ایک پھریری سی دوڑ جاتی ہے اور آپ اپنی توجہ گانے کی طرف سے ہٹا کر بابا صاحب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اہلِ غرض ایک ایک کر کے آتے ہیں اور اپنا دکھڑا الف سے بے کر یے تک سناتے ہیں۔ بابا صاحب نہایت اطمینان یکسوئی اور خندہ پیشانی سے ایک ایک لفظ سُنتے ہیں اور بیچ میں سوالات بھی کرتے جاتے ہیں تاکہ وہ دل کھول کر بیان کر سکیں۔ پھر ایک چھوٹی سی تھالی میں سے راکھ کی بنی ہوئی دو چار ٹکیاں اُٹھا کر دیدیتے ہیں۔ زائر تو اس طرح تین چار آدمیوں کے دُکھڑے سُننے کے بعد تھک جاتا ہے اور اپنی توجہ پھر گانے کی طرف پھیر دیتا ہے۔ مگر اللہ رے خلق کی خدمت کا جذبہ کہ بابا صاحب صبح سے دوپہر تک اور پھر دوپہر سے شام تک اور شام سے آدھی رات تک ہر ایک کا غم سنتے ہیں اور صرف تھوڑی دیر کے لئے حجرہ مبارک میں جو سید ھے ہاتھ پر ہے چلے جاتے ہیں اور پھر واپس آجاتے ہیں۔

بابا صاحب اس قدر ہمدردی اور توجہ سے ایک ایک کی بات سنتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ روزانہ کی اس محنت سے اگر پتھر کا بُت بھی ہو تو تھک جائے اور آدمی کے تو بیٹھے بیٹھے پیر



فیض اور احسان

سُن ہو جائیں۔ پیٹھ پھٹنے لگے۔ مگر باباصاحب کے چہرے پر تکان کا ہلکا سا اثر بھی نہیں ہوتا۔ خطاکار سے خطاکار آدمی سے بھی آپ پھول کی طرح ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔ گویا ہر ایک انسان میں آپ دلچسپی لیتے ہیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ جس کو ایک بار دیکھ چکے ہیں اگر وہ دس سال بعد بھی آپ کی خدمت میں آتا ہے تو آپ اس کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں تمہارا یہ نام ہے۔ تم فلاں سن میں فلاں روز فلاں تاریخ فلاں وقت آئے تھے اور مجھ سے تم نے یہ کہا تھا اور میں نے تم کو یہ جواب دیا تھا۔ وہ اقرار کے الفاظ اپنی زبان سے نکالتا ہے۔ جی ہاں، جی ہاں، جی ہاں۔ بظاہر تو یہ ایک زبردست دماغ کی قوی یادداشت معلوم ہوتی ہے مگر سوچئے کہ سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کی روزانہ کی بات چیت میں ایک ایک کی بات کو یاد رکھنا اور آپ سے آپ دہرا دینا صرف یادداشت ہے یا کچھ اور بھی۔

ایک دفعہ ایک خادم نے آپ سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا "سب سامنے ہوتا ہے"۔ یعنی یہ یادداشت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ قلبِ مومن کے آئینہ کا کمال ہے۔

آپ بیٹھے بیٹھے دنیا کے مختلف ڈرامے، غم یا خوشی کی داستانیں، بیماریوں کے صدہا پہلو، دولت کے بکھیڑوں کے ہزاروں رنگ، باہمی تعلقات کی صدہا پیچیدگیاں، غریبوں کی غربت، دولتمندوں کی اونچ نیچ ۔ عالموں اور پنڈتوں کے مسائل، لاولد خاندانوں کی تمنائیں، سادھوؤں اور طالب حق کے مدارج اور مسائل کی طلب، روحانی، جسمانی اور اخلاقی امراض اور ان کے نسخے ۔ غرض کہ آپ میں دیکھنے اور سمجھنے کا جتنا ظرف ہے اس سے بھی کہیں زیادہ آپ ایک ہی دن میں دیکھ لیں گے اور حیرت میں پڑ جائیں گے کہ یہ زندہ بُت بھی عجیب بُت ہے پتھر کی مورتی کے آگے تو ہم نے یہ تماشے ہوتے دیکھے ہیں ۔ مگر یہ انسان ہے یا کچھ اور جو، ہر ایک سے دھوپ اور بارش کی طرح بلا امتیاز محبت و شفقت کا برتاؤ کر رہا ہے کوئی تعریف کرتا ہے تو بات ٹال دیتے ہیں کوئی جاہل لڑتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے ۔ یا آپ کے جسم کو ہلا ہلا کر جھنجھوڑ کر آپ پر غصّہ ہوتا ہے ۔ تو بھی آپ سوائے مسکرا دینے کے کچھ نہیں کہتے ۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ حاسد اور بد خواہ جان بوجھ کر لڑائی کرنے کے لیئے آئے ہیں کہ جھگڑا ہو ۔ لاکھ ان سے

میٹھی باتیں کی جاتی ہیں مگر وہ آگ برسانے سے باز نہیں آتے۔ ان کے لئے آپ کا یہ حکم ہوتا ہے کہ انہیں کسی درخت کے نیچے بٹھا دیا جائے جب ذرا ٹھنڈے ہو جائیں گے ان کی بات سُنی جائے گی۔ بہت سے لوگ ایسے بھی آتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں جو درد اور دُکھ کے مارے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں اور تقریباً سارے مجمع کے آنسو نکل آتے ہیں۔ بابا صاحب کی آنکھوں میں کچھ نمی آجاتی ہے۔ پھر مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں یہ جگہ رونے کی نہیں ہے۔ تم اپنے سارے غم اس زمین پر گرد کی طرح جھٹک دو۔ روتے ہوئے آئے ہو تو ہنستے ہوئے جاؤ۔

جب کوئی ایسا مرد یا عورت جس پر خبیث روح مسلّط ہو لایا جاتا ہے تو پہلے آپ نہایت محبّت سے پیش آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخص نے ہمارا چہرہ دیکھ لیا ہے۔ تم کہیں اور چلے جاؤ اور جو بار بار سمجھانے پر وہ خبیث روح نہیں مانتی تو حسبِ ضرورت سختی کرتے ہیں۔ اس وقت چہرہ پر جلال ہوتا ہے۔ ساری محفل سہمی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک ناریل منگوا کر زمین پر توڑا جاتا ہے یا کچھ سُوکھے پتّے اور شاخیں منگوا کر جلا دی جاتی ہیں۔ پھر وہ شخص جس پر ناپاک روح

مسلط ہوتی ہے چیخیں مار مار کر سو جاتا ہے اور جب اُٹھتا ہے تو ساری دیوانگی سے پاک ہو جاتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی وقت جوش میں آکر بابا صاحب ارشاد فرماتے ہیں "بابا کی عجب شان ہے جو چیز قسمت میں نہیں ہے وہ بھی دیدیتے ہیں"۔ بظاہر یہ ایک خود ستائی معلوم ہوتی ہے مگر یہ ایک بہت بڑا پردہ ہے اور پہاڑ ہے جس کو توڑ کر چند لوگوں نے بابا صاحب کا قرب حاصل کیا ہے۔ دربارِ عام میں جہاں بابا صاحب لباسِ فقیری میں شہنشاہی شان سے رونق افروز ہوتے ہیں۔ فیض اور احسان کے دریا بہاتے ہیں، وہاں اپنے باطن کی ایک عورت کی عصمت سے بھی کہیں زیادہ حفاظت کرتے ہیں۔ جو طالب قرب چاہتا ہے اس کے لئے اگر ایک پردہ اُٹھتا ہے تو چار پردے اور ڈال دیئے جاتے ہیں۔ شک وشبہ کے پردے۔ سادگی اور بھولے پن کے پہاڑ۔ دنیاداری کے غار۔ تدابیر اور کوششوں کے جنگل، قرب کے طالب کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ مگر دربارِ عام میں فیض کے بارہ در کھلے ہوتے ہیں۔ اس دربار میں کسی نے نہیں کا لفظ آج تک نہیں سنا اور نہ یہ کبھی سنا "تم اپنے کرتوت کے پھل پا رہے ہو

ہم کیا کریں"۔ کسی بدنصیب سے بھی کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارا مقدر ہی خراب ہے۔ اس میں کسی کا کیا چارہ۔ ہر ایک کے لئے چاہے وہ دنیا کی سنڈاس کا طالب ہو یا علم کی پیچیدگیوں میں راہ تلاش کر رہا ہو یا عرفان کے سمندر میں غرق ہو اور ساحل ٹٹول رہا ہو۔ بقدرِ ظرف عطا کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ظرف بھی دیا جاتا ہے اور طلب بھی۔

تو ہی نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

اگر آپ کو کسی شاہی دربار میں جانے کا اتفاق ہوا ہو، تو معلوم ہوگا کہ یہ آداب اور اخلاق شاہی کے خلاف ہے کہ کوئی خالی ہاتھ دربار سے واپس لوٹے۔ بادشاہ کی شرافت اور غیرت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ کوئی اس کے دروازے سے خالی چلا جائے۔ یہ دنیاوی شرافت کا تقاضا اور اخلاقی معیار ہے۔ فقیر جس کا رشتہ اس معبود سے ہوتا ہے اپنی بے نیازی کی اداؤں سے دلوں کو مسخر کرتا ہے اور جو رحمٰن ہے اور رحیم ہے اس کے یہاں کس بات کی کمی ہے۔ فقیر کی شان بھی کیا ہوتی ہے معبود کی صفات جب تک عابد میں نہ آجائیں عبادت کے

کوئی معنی نہیں ہوتے۔ وہ رنگ ہی کیا جو خالص خدائی رنگ صبغۃ اللّٰہ نہ ہو۔ دنیاوی بادشاہوں کے سر تو فقیروں کے پاؤں پر جھکتے ہیں۔ فقیر اپنی مسکینی اور غریبی میں بھی شہنشاہی عظمت و بلندی رکھتا ہے۔ یہ تکبّر نہیں مگر کبریائی ہوتی ہے۔ وہ مالدار نہیں ہوتا مگر استغنا کی شان رکھتا ہے۔ وہ خود عشق میں جلتا رہتا ہے مگر چہرہ چاند کی طرح منور ہوتا ہے جو دوسروں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ فقیر دلوں کا بادشاہ ہوتا ہے اور دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ وہ دلوں کو بدل کر مقدّر کا بھی پانسہ پلٹ دیتا ہے۔ وہ تو فنا کے لاہوتی میدان کو کبھی کا طے کر چکا ہوتا ہے۔ اس لئے فقیری میں کیسی خودی اور کیسی خود پسندی۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اہلِ باطن اپنے آپ کو چھپانے کے لئے عجیب عجیب طریقے اختیار کر لیتے ہیں کوئی بہشتی بنا ہوتا ہے تو کوئی موچی۔ غرض کہ مختلف طرح کے پردوں میں چھپتے ہیں، تاکہ کسی کو یہ اندازہ بھی نہ ہو کہ یہ کس افلاک کے شہنشاہ ہیں۔ جو مجذوب ہوتے ہیں وہ یا تو گندی نالیوں میں پڑے ہوتے ہیں کہ قریب جانے سے گھن آتی ہے یا پھر پاگلوں کی طرح مخش گالیاں بکتے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں تاکہ کوئی قریب نہ آئے۔ یہ



محویتِ جمالِ نظارہ

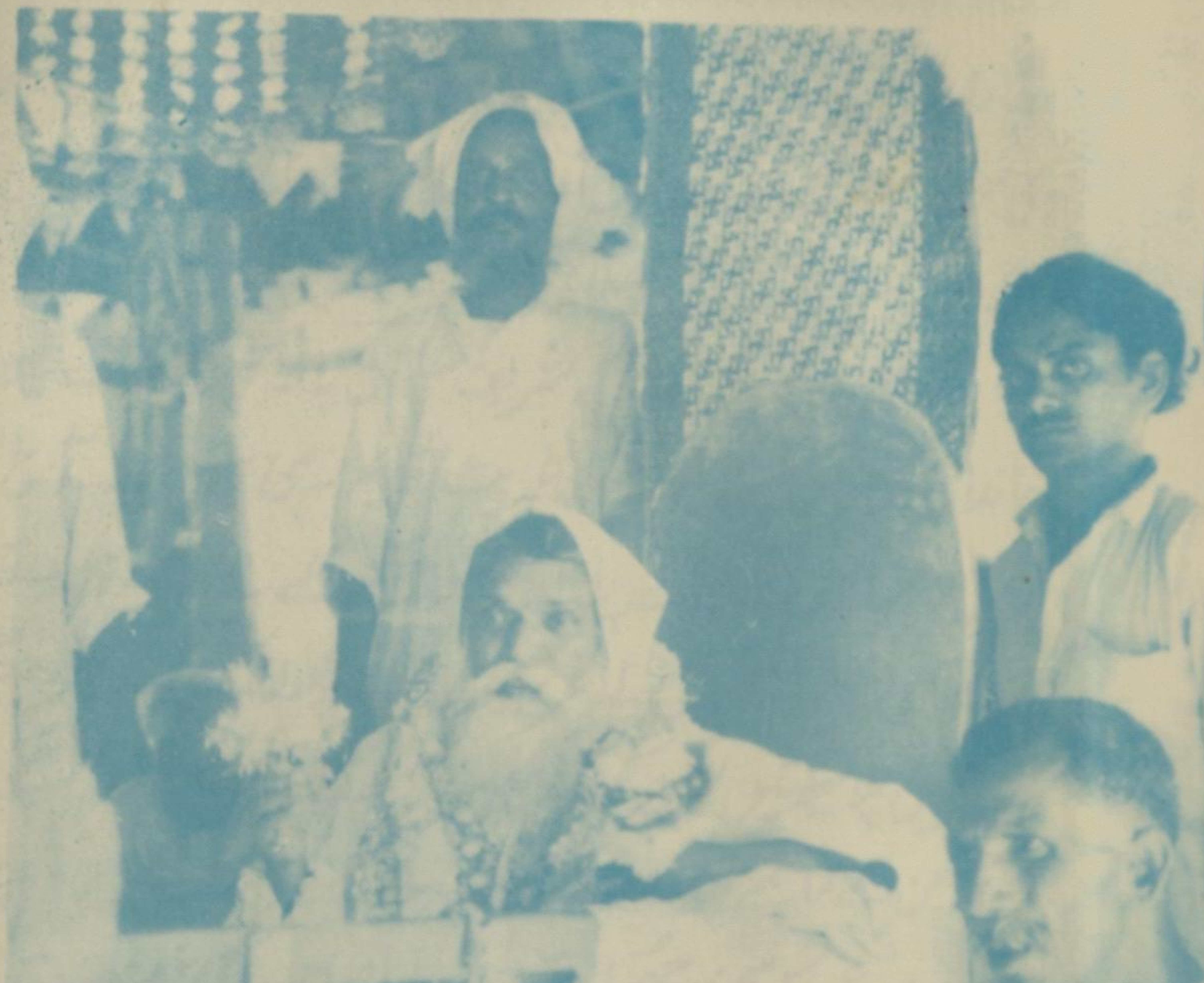
تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

سب پردے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی روحانی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان پردوں کی نوعیت بھی مزاج کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ کہیں یہ پردے کثیف ہوتے ہیں اور کہیں لطیف۔ اور ہر زمانہ کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی ہے اس میں خودی کا پرچار ہے۔ نفسی نفسی ہے۔ وہ مروّتیں اُٹھ گئیں۔ وہ دلجوئی کی شمع بجھ گئی۔ یتیموں کے اوپر ہاتھ رکھنے والے اُٹھ گئے۔ غریبوں کے پیٹ اور جھونپڑیاں جھانکنے والی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس صدی میں ذہانت اور دماغ کی کرشمہ سازیاں روبکار ہیں۔ اس لئے اس زمانہ کا پردہ ایسا ہی ہونا چاہیئے جس کو دماغ عبور نہ کر سکے اور معلم الملکوت کے چیلے دُور ہی رہیں۔

بابا صاحب دربار میں رونق افروز ہیں۔ بائیں طرف سے دنیا آرہی ہے اور جا رہی ہے۔ لیکن داہنی طرف دو چار لوگ ایسے بھی بیٹھے ہیں جو کچھ اور چاہتے ہیں۔ ان میں کچھ جوان ہیں اور کچھ بوڑھے۔ جوان عشق کی ناکامی یا روزگار سے مایوس ہو کر اللہ کو ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ بوڑھے موت کو قریب دیکھ کر اور دنیا کے اندھیرے سے گھبرا کر اللہ کو پہچاننے آئے ہیں۔ درختوں

کے نیچے چند سادھو اور مہنت آسن جمائے وہیں سے ڈورے ڈال رہے ہیں۔ کچھ قلندر قریب سے نعرے لگا رہے ہیں۔ کوڑھی بھی ہیں اور اپاہج بھی۔ بے غیرت بھی اور غیرت مند بھی۔ کوئی قرار چاہتا ہے کوئی خوشی۔ کوئی خودی چاہتا ہے کوئی خدا۔ سب کی آنکھیں ایک چہرے کو تک رہی ہیں اور ایک ہی شخص کی مستانہ آنکھوں میں مچلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ چہرۂ انور مہتاب کی طرح دمکتا رہتا ہے۔ جہاں تک دربارِ عام کا تعلق ہے فیض عام ہے۔ ہر کسی کی رسائی ہے ہر ایک سے محبت و شفقت ہے۔ مگر طالبِ حق کو دربارِ عام کے بعد آگے بھی جانا پڑتا ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ دنیاوی اغراض لے کر آتے ہیں اور انہیں اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کون سا جوہر چھپا ہوا ہے۔ کچھ روز قیام کرتے ہیں اور ان کے پردے ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں۔ وہ دنیا اور دین دونوں لُوٹ کر لے جاتے ہیں۔ اس دربار میں کبھی بھی کسی نے یہ نہیں سُنا کہ تم یا تو دنیا لو یا دین۔ جو دنیا مانگتا ہے اس کو بھی دین و دنیا ملتی ہے اور جو صرف دین مانگتا ہے اس کو بھی دین و دنیا — عزلت نشینی، رسمی فقیری، بھیک مانگنا، فقیر یا سادھو کا لباس پہن کر



دربارِ عام

دنیاداروں کے سامنے اپنے آپ کو اللہ والوں کی شکل میں پیش کرنے کی سخت ممانعت کرتے ہیں اور وہ راستہ دکھاتے ہیں جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائی ہو۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شریف مسلمان یا راجپوتوں کے ایسے خاندان جن میں نسلاً بعد نسلاً غربت قایم رہی ہو اور آج ان کی باحیا عورتوں کے پاس تن ڈھکنے کے لئے پھٹے ہوتے کپڑے بھی نہیں، جو اپنے لاغر جسموں سے بچوں کو پیٹ بھر دودھ بھی نہیں پلا سکتیں، جن کی آنکھیں آنسوؤں سے خشک ہو چکی ہیں۔ جن کے ماتھے امیدوں کی جھلک سے محروم ہو چکے ہیں۔ اپنے سینوں میں غم کے سمندر چھپاتے جب باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور عرض کی ہے کہ باباجی آپ اللہ کے پیارے ہیں۔ دعا کیجیے کہ ہمارے دن پھر جائیں۔ اس وقت باباصاحب کی آنکھیں شبنمی غلاف میں ملبوس ہو جاتی ہیں جیسے کوئی دور کی چیز دیکھ رہے ہوں۔ چہرے پر غم کا اثر ہوتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں اس غم کی گرد کو صاف کر کے گلاب کے پھول کی طرح مسکراتے ہیں اور چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ گلاب کی پتیاں سامنے رکھی ہوتی ہیں، اٹھا لیتے ہیں اور بہت اونچی آواز میں جیسے فطرت کی

ساری واقعتوں کو بآواز بلند سُنا رہے ہوں۔ فرماتے ہیں تم غم نہ کرو۔ تمہاری مرادیں پوری ہوں گی۔ تمہاری لڑکیوں کی شادی اچھی جگہ ہو جائے گی۔ تم اپنے لڑکوں کو تجارت میں لگاؤ۔ وہ بھی خوش حال رہیں گے اور تم میاں بی بی بھی فلاں کام کرو۔ یہ پھٹے کپڑے نہیں رہیں گے اور تم بھی چار کوڑی والے ہو جاؤ گے۔"
اس وقت ان غریبوں کے چہرے دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں۔ اور صدیوں کے غم جو شرافت کے تقاضوں کی وجہ سے چھپے رہتے ہیں ڈھل جاتے ہیں اور ان کے اچھے دن آجاتے ہیں۔ انہیں کوئی دفینہ نہیں ملتا، نہ ہی چھپر پھاڑ کر دولت آتی ہے۔ اور دولت تو خواہ دیگوں بھری ملے آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے مگر جن کی قسمت جاگ جاتی ہے ان کے ہر کام بننے اور سنورنے لگتے ہیں۔ بگڑی سنورتی چلی جاتی ہے۔ اس دربار میں بہتوں کی قسمت جاگتی دیکھی گئی ہے۔

جب تک اہلِ غرض کی قطاریں گزرتی رہتی ہیں، موتی نامی دودھ جیسے سفید اور لمبے لمبے ریشمی بالوں والا ایک کتّا آپ کے داہنی طرف بیٹھا رہتا ہے۔ یعنی جب تک بابا صاحب بیٹھے رہتے ہیں،

بیٹھا رہتا ہے۔ جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو یہ کتا خود کھڑا ہوجاتا ہے۔ بابا صاحب فرماتے ہیں اچھا تجھے بھی تبرک چاہیئے اور اپنی ہتھیلی پر دو چار راکھ کے ٹکڑے رکھ کر کھلا دیتے ہیں۔ خدا ہی جانے اُسے ان ٹکڑوں میں کیا مزا ملتا ہے جو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔

اس دربار کے ختم کرنے کے بعد بابا صاحب اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر ایک راجپوت عورت آتی ہے اور شاہ ظفر کی ایک دردناک غزل گاتی ہے۔ بابا صاحب پھر ایک گہرائی میں غرق ہوجاتے ہیں۔ وہ سلطنتیں کیا ہوئیں۔ وہ بادشاہ جو فقیروں کے دل لئے ہوئے تھے وہ کیا ہوئے۔ وہ دین جس نے فقیری اور بادشاہی ایک کرکے دکھایا تھا۔ کیا فقیروں ہی کے سینہ میں محدود ہوکر رہ جائے گا یا کردار اور اخلاق سے دنیا میں جاہ و جلال کے ساتھ فطرت کی طاقتوں کو اپنائے گا۔ کیا یہ دنیا جو بظاہر علم کی روشنی میں باطن کی تاریکی کما رہی ہے۔ اس دین کے ذریعہ پھر سے اللہ کی طرف لوٹ جائے گی۔ کیا یہ دین انسان کو پھر سے انسان بنائے گا۔ کیا یہ دین ان دلوں میں خود پرستی کی جگہ خدا پرستی کا بیج بو دے گا۔

شاہ ظفر کے ساتھ مشرقی عروج کا چراغ گُل ہو گیا۔ کیا یہ چراغ پھر سے کبھی روشن ہو گا۔ البتہ جو ھوالظاہر اور ھوالباطن ہے جو ھوالاول اور ھوالآخر ہے اس کا بھی کبھی بول بالا ہو گا۔ کیا کبھی اس دنیا میں قوموں کے عَلَم نصب ہونے کی جگہ حق کے عَلَم بھی نصب ہوں گے۔ معلوم نہیں اِن آنکھوں کے سامنے جو شبنمی پردہ ہے اس کے پس پردہ کیا کیا خیالات ہیں، اور کیسے کیسے ولولے۔

جب آپ حجرہ مبارک میں تشریف لے جاتے ہیں تو چارپائی پر ساکت لیٹ جاتے ہیں۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہاتھ سر پر باندھے ہوتے ہیں اور کوئی خادم پنکھا جھل رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اُس خادم کو بھی باہر کر کے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے پھر آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ دربار میں خاموشی رہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی قوّال کچھ عشقیہ چیز گا کر اس سکوت میں عجیب کیف پیدا کرتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے، بابا صاحب بالکل ترو تازہ جیسے کوئی تھکن ہی نہ ہو مسکراتے ہوئے باہر آتے ہیں اور محفل خانہ سے متصل پیچھے کی جانب جو دو کمرے ہیں اس سمت کسی خادم کے ہاتھ کا سہارا لے کر نہایت پھرتی سے چلے جاتے ہیں۔

جو تیرے عشق میں خراب ہوئے
وہ بہر حال کامیاب ہوئے

دن کو چمکے تو آفتاب ہوئے
رات آئی تو ماہ تاب ہوئے

چاند تاروں میں ضو انہی کی ہے
اپنے جلووں میں خود حجاب ہوئے

میکدہ اُن کے دم سے قائم ہے
جام مینا بنے شراب ہوئے

ذکر میں ہے تڑپ کلی کی طرح
فکر میں کھِل گئے گلاب ہوئے

باغِ ہستی میں جب بہار آئی
بوئے گل بن کے بے نقاب ہوئے

عقل کے سامنے رہے خاموش
دار پر حرف لاجواب ہوئے

عرش بالائے عرش ہیں یہ لوگ
طور پر آتے شعلہ تاب ہوئے

جو گھڑی اُن کی یاد میں گزری
اُس گھڑی لطف بے حساب ہوئے

دربارِ خاص   باب ۱۰

اب جو دو چار دن یہاں رہنا ہے تو آیئے گھوم پھر کر دیکھیں یہاں کون کون رہتا ہے اور کیا کیا ہوتا ہے۔ محفل خانہ سے متصل کبوتروں کا ایک بہت بڑا کمرہ بنا ہوا ہے۔ دودھ جیسے سفید لقا کبوتر کس مزے سے رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سے کیسی محبت اور کیسا پیار ٹپکتا ہے۔ کاش ان بھولے معصوم کبوتروں کے برابر ہم میں پیار و محبت ہوتا تو آج ہم اسفل السافلین کی حد تک نہ گر چکے ہوتے۔

ذرا آگے بڑھئے ایک مجذوب خلقت کی طرف بیٹھ کیئے ہوئے اونچی آواز میں اس قدر فحش اور تازہ تازہ گالیاں بک رہے ہیں کہ ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بزرگ برسوں اسی دربار کی بکریاں چراتے رہے ہیں۔ بکریوں کا ایک بہت بڑا گلہ ہے جو رات کے وقت ان ہی کی جھونپڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ہیں تو دیوانہ مگر اللہ جانے کس کے دیوانہ



فیض

ہیں کہ یہ حالت ہے کہ آپ پشت سے ابھی قریب بھی نہیں پہنچے کہ آپ کا آگا پیچھا سب کچھ کسی بکری یا درخت کو مخاطب کر کے کہہ ڈالا ہنستے بھی جاتے ہیں اور گالی بھی دیتے جاتے ہیں۔ اب قریب پہنچ کر سلام کیجیئے تو جواب ندارد اور دعا کے لئے عرض کیجیئے تو دس بیس مغلظ گالیاں دے ڈالتے ہیں۔

اب ذرا آگے بڑھیئے ایک اور مستانہ نظر آتے ہیں۔ ان کا ایسا بھولا چہرہ ہے کہ جیسے ان گایوں کا جن کے گلّے کو محبّت اور شفقت کے ساتھ جنگل میں چرانے کے لئے یہ لیجایا کرتے ہیں۔

آگے بڑھیئے تو ایک بڑا جھونپڑا ہے جو لنگر خانہ کہلاتا ہے۔ کچھ عورتیں یہاں ترکاری بنا رہی ہیں، کچھ چاول صاف کر رہی ہیں۔ بطخ، قاز، مُرغیاں اور کتّوں کے آٹھ دس پِلّے دروازہ کے آس پاس تاک جھانک میں ڈٹے ہوتے ہیں۔ اس لنگر خانہ میں روزانہ چالیس پچاس خادم اور کئی غربا کھانا کھاتے ہیں۔ نہ کوئی جائداد ہے اور نہ کوئی ذریعہ آمدنی۔ حالت یہ ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ کل چولھا سلگے بھی کہ نہیں۔ نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، نہ کل کے لئے آج ہی سے فکر مند ہونا۔ خادم یہ کہتے ہیں کہ کل کے لئے بھی وہی کرے گا جو آج تک کرتا چلا آیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ

لنگر خانہ کا انتظام کرنے والی عورتوں کو یقین ہے کہ صدہا انسان، چرند و پرند اس دربار میں نہ کبھی بھوکے رہے اور نہ کبھی بھوکے رہ سکتے ہیں۔ اسی لئے کبھی دودھ اور گلاب کی چائے دیگوں میں بن رہی ہے تو کبھی ہفتوں تک پلاؤ اور بریانی پکائی جا رہی ہے۔ کبھی کبھی قانونِ قدرت کا اتار چڑھاؤ برقرار رکھنے کے لئے بجائے تین وقت ایک یا دو ہی وقت کھانا پکتا ہے اور کبھی سادہ چاول اور چٹنی پر گزارہ ہوتا ہے مگر بھوکا کبھی کوئی نہیں رہا ہے۔

رزق کا ربوبیت سے تعلق ہے اور رسولِ کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معراج میں اللہ جل شانہ، کو میرا رب ہی کہہ کر پکارا۔ اس میں ایک عجیب راز پنہاں ہے۔ رزق ایک نشان ہے پرورش کا زندگی کا اور حیات کا۔ فطرت کا تقاضا تسلسلِ نسل کے لئے اس بھوک ہی کے ذریعہ پورا ہوتا ہے۔ اسی لئے پیٹ کی بھوک اچھے اچھوں کو برا بنا دیتی ہے۔ اگر آپ کبھی ہفتوں بھوکے رہے ہوں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ پیٹ کی آگ کس چیز کو کہتے ہیں اور یہ کہ فقیر کو کیوں غریبوں اور بھوکوں سے اتنا اُنس ہوتا ہے۔ یہ لنگر خانہ دنیا کی نظر میں تو کئی جانوں کی رزاقی کرتا ہے۔ مگر اہلِ نظر کے لئے یہاں ربوبیت کی نشانی ہے۔ جو معنیٔ تخلیق ہے، اور

روانی وجود ہے اور ازل سے ابد تک کے سلسلہ کی ایک سیڑھی ہے۔

لنگر خانہ سے آگے چلیئے تو جھونپڑیاں ہیں جن میں کچھ لوگ بسے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اپنا بھید بتاتے ہیں کہ کیسے آئے اور کیوں یہاں بسے۔ ان میں اکثر ایسے ہیں جو یہاں پر ہمیشہ کے لئے بس گئے ہیں۔ اِن جھونپڑیوں سے آگے بڑھیئے تو سڑک کی دونوں طرف وہ مسافر ہیں جو عموماً مہلک بیماریوں سے شفا کی خاطر یہاں آکر پڑ گئے ہیں۔ دو سال پہلے ان لوگوں کی یہ حالت تھی کہ ان کے جسم جذام سے گلے ہوئے تھے اور ان کے زخم ایسے رِس رہے تھے کہ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی بہت مشکل کام تھا۔ اب تقریباً سارے زخم سُوکھ گئے ہیں۔ دوسروں سے یہ لوگ ہاتھ ملاتے ہیں اور صرف غور کر کے دیکھنے سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ذرا ذرا سی سُرخی اور خفیف سے نشان ابھی ادر باقی ہیں۔

اِن لوگوں میں آٹھ دس ایسے غریب جذامی بھی ہیں جو شہر کی گلیوں میں بھیک مانگ کر نمعلوم کس لئے اپنی زندگی کو قائم رکھنے کی کوشش میں تھے۔ مگر اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ سخت مزدوری کرتے ہیں اور لوگ ان سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کچھ ایسے غریب بھی ہیں جن کو سال ڈیڑھ سال پہلے دیکھا تھا کہ ان کا نچلا بدن

سوکھ کر ایک گٹھڑی کی طرح سمٹ گیا تھا اور یہ لوگ زمین پر گھسٹ گھسٹ کر بھیک مانگا کرتے تھے۔ اب ان میں سے کچھ لوگ لکڑی کے سہارے اور کچھ بغیر سہارے چل پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ مدتوں زمین پر گھسٹتے رہے۔ اب بھی ان کے گھٹنوں پر تھوڑے تھوڑے نشان ضرور ہیں مگر چہرے پر تازگی ہے اور ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں احساس ہے کہ وہ زندہ ہیں اور دنیا میں کچھ کریں گے۔

ذرا آگے بڑھیئے تو کہیں دور سے آئے ہوئے ایک رئیس صاحب ہیں جن کو چھ مہینے پہلے سارے ڈاکٹروں اور اطبا نے مکمل کوشش کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ ان کے دماغ کا کوئی علاج ہی نہیں۔ آج یہ بھی ہنس بول رہے ہیں اور اجازت کے خواہاں ہیں کہ پھر سے دنیا میں جائیں اور اپنا کاروبار سنبھالیں کہاں تک بیان کیا جائے۔ نہ معلوم ایسے کتنے لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی دنیا لئے ہوئے ہے اور اس کی کہانی ایک مستقل داستان بن سکتی ہے۔

ایک بیوہ عورت کی داستان سُنئیے جو خاموش تھی مگر خوش نظر آتی تھی۔ اس کا اکلوتا لڑکا جس کی عمر دس گیارہ سال کی

ہو گئی، عرصہ سے بیمار تھا۔ اس نے بشارت دیکھی اور ماں سے ضد کرنے لگا کہ ہمیں قادر نگر لے چلو۔ غریب ماں تے نہ جانے کیسے پانچ سو میل کا سفر طے کیا اور یہاں آئی۔ چار پانچ دن کے بعد یہ لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ماں کی آنکھ میں نہ اب کوئی آنسو ہے نہ اس کی جبیں پر کوئی غم کے آثار ہیں۔ نہ معلوم وہ کس جنّت کے پھول کی خوشبو میں مست ہے۔

اللہ پر یقین تو بقدرِ ظرف تقریباً ہر ایک کو ہوتا ہے ملحد کو بھی کوئی نہ کوئی گمان اور کھٹک ضرور ہوتی ہے اور جو دنیا میں سرگرم ہیں ان کو بھی سکتہ اور سکوت کے روپ میں کبھی نہ کبھی یہ خیال ہو ہی ہو جاتا ہے۔ غرض ہر ایک کو یہ خیال اور یہ یقین ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پتّے پتّے کو ہوتا ہے۔ مگر حیات بعد الممات پر یقین بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی یقین بڑی کٹھن منزل ہے۔ قرونِ اُولیٰ کے سادہ اور ان پڑھ مسلمانوں کو اس زمانہ کی جلیل القدر اور عظیم الشان سلطنتوں پر جس چیز نے حاوی کر دیا تھا۔ وہ یہی یقین تھا۔ قابلِ تعریف ہے وہ بیوہ عورت جس کا اکلوتا لال اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور وہ اس جدائی کی آگ کو برداشت کرتی ہے۔ اس کا لال آنکھوں سے غائب

ہے مگر وہ عالی ظرف ماں کی طرح اس مامتا کو بھی راستہ میں نہیں آنے دیتے جو ماں کی فطرت ہے ۔ وہ اپنے پیٹ سے نکلے ہوئے اکلوتے کو اپنے ہاتھوں سے نہلا کر اور سنوار کر زیر زمین دفن کر دیتی ہے مگر روحانی خوشی نہیں کھوتی ۔ اس عورت کو حیات بعد الممات کا جو یقین ہے اس کا ایک ذرّہ بھی دنیا والوں کو مل جائے تو دنیا کی عشرت اور رنگینیوں پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کریں ۔ جس قسم کی خوشی اس عورت کو آج میسّر ہے ' اس سے اندازہ لگتا ہے کہ ضرور جنّت کے پھول کی خوشبو سے یہ عورت آج معطر اور معنبر ہے ۔

ایک طرف نظر دوڑائیے تو برگد کے نیچے ایک سادھو آسن مارے بیٹھا ہے ۔ اس کا چہرہ اس قدر حسین ہے کہ شاید ہی کسی نے دیکھا ہو ۔ یہ سادھو مشہور مصوّر رے فائیل کی بنائی ہوئی مسیح کی مورت معلوم ہوتا ہے ۔ نازک نقشہ ' داڑھی اور سر کے بال ریشمی ' دو دمکتی ہوئی آنکھیں ۔ اس کا کتنا دلکش حُسن ہے ۔ اس سادھو کا حال یہ ہے کہ یہ ایک جنوبی ہند کا برہمن ہے ۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ویراگ اختیار کر لیا اور بائیس سال ہندوستان تبت اور ہمالیہ کی بڑی بڑی خانقاہوں

میں گیا اور رشیوں کی خدمت کرتا رہا پھر بھی کچھ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر گھر لوٹ رہا تھا کہ اتفاقاً ادھر بھی آگیا اور بابا صاحب کے سامنے پہنچ کر بہت سخت وسُست سُنانے لگا کہ تم لوگ مہاتما بنے بیٹھے رہتے ہو۔ مانا کہ آسمانوں پر پرواز کرتے ہو اور چاند سورج کو مٹھی میں لئے ہوتے ہو مگر ہمیں اس سے کیا۔ تم لوگوں کا سارا طبقہ نہایت ہی خودغرض اور ظالم ہے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ بابا صاحب نے غور سے سُنا اور یہ ارشاد ہوا کہ ایسا مت کہو۔ یوں کہو کہ تم نے بہت چکر کاٹے مگر تمہارے مقدّر کا پھل کہیں اور ہی تھا۔ ایک آدھ دن اس برگد کے نیچے گزارو پھر چلے جانا۔ یہ سادھو وہاں سے مذبذب لوٹا اور یہ سوچ کر کہ چلو جہاں ایک عمر گزار دی، یہ ایک رات اور سہی۔ بغیر کسی خیال یا امید کے اس برگد کے نیچے لیٹ رہا۔ صبح جب بابا صاحب دربار میں رونق افروز ہوئے تو دیوانہ وار جا کر بابا صاحب کے قدموں سے لپٹ گیا۔ کوئی بات چیت نہیں ہوئی واللہ اعلم اس ایک رات میں کیا کچھ ہو گیا۔ یہ سترہ دن اسی برگد کے نیچے پڑا رہا۔ اس کے بعد اس کا جوگیانہ لباس اتار کر دریا میں پھکوا دیا گیا اور اس کو ایک سفید جبّہ اور تہبند عطا ہوا، اور حکم ملا کہ تم بھدراچلم کے رامیشور مندر کے قریب جو ایک پرانا درخت

ہے اس کے نیچے بیٹھو۔ اس سادھو کی تو ایک مثال ہے ۔ ایسے
نہ معلوم کون کون یہاں آتے ہیں اور جانے کیا کیا لے جاتے ہیں۔
یہ خاصانِ خاص کا معاملہ ہے۔

اور آگے چلیئے ایک برگد کے نیچے ایک چھوٹے بچّے
کے بال اُتارے جا رہے ہیں۔ اس کے ادھیڑ عمر کے ماں باپ پاس
ہی کھڑے ہیں۔ بچہ بہت خوبصورت اور تندرست ہے۔ یہ لاولد
تھے۔ اجازت لے کر گئے تھے اور خوش خوش نیاز منانے کے لئے
آئے ہوئے ہیں۔

ایک اور برگد کے نیچے دو بڑے بڑے دیے جل رہے ہیں۔
یہ اس لئے ہیں کہ کسی خاندان کی زندگی کا تسلسل جو ختم ہو چکا تھا
آج پھر سے جاری اور روشن کر دیا گیا۔ یہ امر جیوتی کا سلسلہ اب
جاری رہے گا۔ اسی لئے آج شام کو نیاز ہے۔ دس من کی دیگ
پکے گی۔ امیر اور غریب سب زمین پر بیٹھ کر اس میں شرکت کریں
گے۔ دیکھا گیا ہے کہ یوں تو بابا صاحب چاہے آپ کچھ بھی کریں
آپ کی ہر چیز کو پسند فرماتے ہیں مگر خوش ہوتے ہیں تو غریبوں
کو کھانا کھلانے سے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے انہیں بڑی
بھوک تھی اور جو کھانا یہ بھوکی خلقت کھاتی ہے وہ گویا آپ ہی

کھاتے ہیں۔ اس کھانے میں کوئی خیرات اور ثواب کا سوال نہیں۔ کبھی کبھی آپ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ دل سے کوئی کیا دعا کر سکتا ہے۔ اس چودھویں صدی میں تو دل کا پتہ ہی نہیں، مگر پیٹ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ پیٹ کی دعا اور مقبولیت میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ جو بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے اور اس کی آگ بُجھتی ہے تو وہ خود ہی دعا ہے۔ کچھ منہ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہی ایجاب ہے اور وہی قبول ہے۔ اس قسم کی دعوتیں اور نیاز آئے دن ہوتی ہیں۔ اس قسم کے موقعوں پر اس چھوٹی سی بستی کے غریبوں کی خوشی کا تو کیا ذکر۔ وہاں جو بہت سے کتے رہتے ہیں ان کی کود پھاند اور چہل پہل تک دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

یہ تو تھے آس پاس کے حالات۔ رہا محفل خانہ۔ تو وہاں جب کوئی نہ ہو تو دن کو آرام کر سکتے ہیں۔ اگر آپ پر کرم ہے تو دوپہر کے وقت ایک خادم آتا ہے اور کہتا ہے کہ چلئے بابا صاحب نے کھانے پر بلایا ہے۔ بابا صاحب کا کھانا ان کی بہن کے یہاں سے ایک توشہ دان میں آتا ہے۔ لنگر خانہ کا کھانا بھی موجود ہوتا ہے اور جو کھانا باہر کے آئے ہوئے خوش حال مسافروں نے بھیجدیا وہ بھی ہوتا ہے۔ محفل خانہ کی پشت پر جو دو کمرے بنے ہوئے ہیں،

ان میں سے ایک کمرہ میں ایک طرف چارپائی بچھی ہوتی ہے اور اس کے بازو میں زمین پر دسترخوان بچھا دیا جاتا ہے۔ ایک خادم برتنوں میں کھانا نکال کر سب کے سامنے رکھ دیتا ہے بابا صاحب دسترخوان کے سرے پر بیٹھتے ہیں اور ایک طرف راجو ماسٹر جو ایک بہت ضعیف راجپوت ہیں اور جنہوں نے بابا صاحب کو لڑکپن میں الف بے تے پڑھائی تھی، وہ ہیں اور دو ایک اور مہمان۔ دسترخوان کے آداب وہی پرانے زمانہ کے آداب ہیں۔ زبردستی آپ کو اس قدر کھلایا جاتا ہے اتنی خاطر تواضع کی جاتی ہے کہ نہ کبھی ماں باپ کے گھر میں ہوئی ہو گی اور نہ نئی نئی سسرال میں۔

زیادہ کھانے کے باعث کبھی جو آپ کی سانس پھولنے لگے تو بابا صاحب ہنس کر یوں فرماتے ہیں کہ اس کو بھی ریاضت سمجھو۔ اس چھوٹے سے جملہ میں کتنے معنی پنہاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیٹ کے ضرورت سے زیادہ بھر جانے کے بعد جو انسان اور زیادہ کھائے اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ لذیذ چیزوں کی ساری لذّت کو بھول جاتا ہے اور جوں توں جس طرح ہو سکے چبا کر لقمہ کو حلق کے نیچے دھکیلنے کی کوشش کرتا ہے

اب جو وہ کھاتا ہے تو نفس کی خواہش کے تحت نہیں کھاتا بلکہ حکم پورا کرنے کے لئے کھاتا ہے۔ چاہے آپ دائمی مریض ہی کیوں نہ ہوں! آپ کی پھولی ہوئی سانس دیکھ کر بابا صاحب یوں فرماتے ہیں کہ ہاضمہ کی فکر نہ کرو یہاں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ اور واقعتاً یہی دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو دس بارہ سال سے آش جو پر اپنی زندگی کاٹ رہے تھے اس دستر خوان پر خوب پلاؤ اور مچھلی اڑاتے ہیں۔ مگر انہیں کھٹی ڈکار بھی نہیں آتی' اور خانقاہوں میں تو یہ دیکھا گیا ہے کہ روزہ اور فاقہ کے ذریعہ نفس کو جلایا جاتا ہے۔ یہاں نفس کو موٹا کر کر کے مٹھی میں سمایا جاتا ہے۔ خوب کھاؤ پیو۔ دن بھر گانے سنو۔ سیر کرو اور ہنستے بولتے' کودتے پھاندتے منزلیں طے کرتے جاؤ۔ یوں فاقہ سے رہ کر شب بیداری آسان ہے مگر بھرے ہوئے پیٹ پر شب بیداری کرنے کے لئے انسان کو نفس سے بالاتر ہو جانا پڑتا ہے۔ اور یوں اس کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔

یہ کھانے کا وقت بھی خاص وقت ہوتا ہے۔ اس کو دربار خاص کہیں تو بیجا نہ ہو گا۔ اس لئے کہ تمام عمیق اشارات'

دور رس ہدایات اور خدا جانے کیا کیا رمز اس دستر خوان پر فرمائے جاتے ہیں۔

ایک چینی فلسفی لن یت سین جو ایک بہت بڑا فلسفی گزرا ہے۔ مہذّب لوگوں کے ذوقِ طعام کے متعلق لکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ تاریخِ انسانی میں جنگلی لوگوں سے لے کر مہذّب ترین سلطنتوں تک کے سارے سمجھوتے اور فیصلے اور ساری گتھیوں کا سلجھانا اور آپس میں صلح کے فیصلوں پر پہنچنا یا لین دین اور بین الاقوامی تعلقات پر ایک رائے ہونا۔ دستور ساز اسمبلیوں میں نہیں ہوا بلکہ یہ سب دستر خوان کے تصرّف سے ہی وجود میں آیا ہے۔ انسان خصوصًا مردچاہے وہ کتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو کسی حد تک پیٹ کا کچّا ہوتا ہے۔ پیٹ کی لگی ہوتی ہے تو اللہ سے بھی لگاؤ رکھتا ہے۔ مگر جب پیٹ کو شانتی اور سکون میسّر نہیں آتا تو یا تو اپنی سطح سے گر کر نفس ہی نفس ہو کر رہ جاتا ہے یا اگر اس میں کچھ ہے تو نفس سے اُٹھ کر مولیٰ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہی اس کے لئے ایک نازک پلِ صراط ہے۔

ویسے تو بابا صاحب کے سامنے آپ لذیذ کھانے کھا رہے ہوتے ہیں۔ مگر آپ کا سفر پلِ صراط پر سے ہوتا ہے۔ اچھّے اچھّے

لقمے، چُننے چُننے پھل منت وزاری سے گھگھیا کر آپ کو کھلاتے ہیں۔ اس کے بعد اور تھوڑا سا اور تھوڑا سا کہنا بظاہر خلوص و محبت واخلاق حسنہ ہے۔ مگر جو آپ بھگتی کے لئے آئے ہیں تو ان سے گزر کر اور آگے چلنا ہوگا۔

عموماً ہر وقت اور خصوصاً اس وقت یہ دیکھا گیا ہے کہ بابا صاحب کا ایک ایک لفظ اور ہر ایک اشارا دفترِ معرفت ہوتا ہے۔ بظاہر سادہ گفتگو ہوتی ہے کہ یہ چاول پرانے ہیں، اس اچار میں نمک بہت ہے، ہمیں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بہت پسند ہیں، اس چھاچ میں نمک ہے ہی نہیں، مگر جیسا کہ آگے وضاحت ہوگی ایک ہی فقرہ کو لے لیا جائے تو ایک انسانی زندگی کے لئے کافی ہے۔

گرمیوں کے موسم میں صبح ناشتہ کے وقت کمرہ کے باہر درخت پر سے کوئل کی دلفگار آواز کچھ اتنا گہرا اثر کرتی ہے کہ یکلخت بابا صاحب کی زبانِ مبارک سے اور دوسروں کے منہ سے بھی ایک ساتھ یہ آواز نکلتی ہے۔ "کیسی پیاری بولی ہے۔" ذرا سی خاموشی کے بعد بابا صاحب یوں متکلم ہوتے ہیں۔ "تمہیں معلوم ہے کہ کوئل کیا بول رہی ہے۔ یہ اپنے بچوں کو اپنی طرف بلا

رہی ہے۔ یہ بڑا بھولا پرندہ ہوتا ہے۔ اسے اپنے انڈوں کو خود سینا نہیں آتا۔ کوّے کے گھونسلہ میں اپنے انڈے رکھ آتی ہے۔ کوّا ہوتا تو بڑا سیانا ہے مگر اپنے ہی انڈے سمجھ کر کوئل کے انڈے سیتا ہے۔ جب بچوّں کے بال و پر نکل آتے ہیں تو کوئل کو اپنے بچوّں کی یاد ستاتی ہے اور وہ اس درد بھری آواز میں پکارتی ہے۔ بچے پھڑ پھڑا کر اُڑتے ہیں اور اپنی ماں سے آملتے ہیں"۔

بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے جو اکثر سُنتے آئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت دستر خوان پر آپ کے ایک مرید بھی تھے جو کچھ پڑھے لکھے بھی تھے اور عالم بزرگوں کے زیادہ قائل تھے۔ یہ صاحب کہیں شمالی ہند میں ایک عالم قلندر سے دو تین سال تک صرف لا الٰہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بڑی گرمی تھی، خوب سینک ملی۔ انڈے سے بچہّ نمود میں آیا اور بال و پر بھی پھوٹے مگر اب کسی تربیت کی ضرورت تھی۔ کوئل نے آواز دی اور بچہّ یعنی مرید اپنے پیر کے قدموں میں پھر سے آگیا۔

کتنے لطیف اور عمیق انداز سے اس دستر خوان پر گفتگو ہوتی ہے۔ اس کی کیا توضیح کی جائے۔ یہ دربار خاص جو ٹھہرا، اور ہر ایک سے خصوصیت جو ہوئی۔ خدا جانے ایسے کتنے خاص الخاص

اشخاص اس دستر خوان سے سیر ہو کر نکلے ہیں۔ چونکہ حضور کی تعلیمات کا نچوڑ (خصوصاً طالبانِ حق کے لئے) اسی دربار سے ملتا ہے۔ اس لئے چند اور مجلسوں کا ذکر درج ذیل ہے۔

آپ کھانے کی چیزوں میں مچھلی کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ بظاہر مچھلی نرم، گرم اور لذیذ ہوتی ہے۔ مگر ایک خادم کا بیان ہے کہ برسوں مچھلی کی تعریف اور وضاحت اور اس سے شوق کی بابت سُننے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بابا صاحب کو جنہوں نے اپنے آپ کو جلا جلا کر پھونک ڈالا ہے کھانے پینے کی چیزوں کی لذتوں سے کیا واسطہ۔ ایک وقت ارشاد ہوا تھا کہ چوپائے تو میدانوں میں خوب سیر ہو کرتے ہیں۔ خوب زقندیں بھرتے اور پھلانگیں لگاتے ہیں اور چھوٹی موٹی ندی بھی راستہ میں آجائے تو ہاتھ پیر چلا کر پار نکل جاتے ہیں۔ مگر سمندر کی پیراکی تو مچھلی کے ہی حصّہ میں ہے۔ اس کے ہاتھ پیر نہیں ہوتے مگر وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کے بوتہ پر اپنا سفر طے کرتی ہے۔ تو اس کی کچھ سمجھ میں آیا۔ اللہ اللہ کتنا لطیف اشارہ تھا کہ جویائے حق اپنے کسب سے بھی بہت سی منازل طے کر لیتے ہیں۔ مگر عرفان کا سمندر "صمٌ بکمٌ" یعنی عملِ ظاہر سے ماورا ہو کر باطن ہی کے ذریعہ

(ریڑھ کی ہڈی کے بوتے پر) طے کر سکتے ہیں۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک بہت چھوٹی سی مچھلی دکھا کر ارشاد فرمایا۔ یہ مچھلیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ انسان کا رجحان اگر چھٹپن سے ہی حق کی طرف ہو تو اس کا پیر کامل بہت جلد اپنے میں بسا لیتا ہے۔ ایک دفعہ ایک خادم کو ایک مچھلی کا ٹکڑا دے کر ارشاد ہوا دیکھو اس میں کتنے بڑے اور سخت کانٹے ہیں۔ انہیں نکال کر کھاؤ کہیں حلق میں پھنس نہ جائیں اور عموماً آپ جب کبھی کسی کو مچھلی کا ٹکڑا اپنے دست مبارک سے مرحمت فرماتے ہیں تو اچھی طرح دیکھ دیکھ کر ایک ایک باریک سے باریک کانٹا نکال کر پھر چُپکے سے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں۔

ایک خادم کا بیان ہے کہ برسوں تک اس کو یہ کہہ کر مچھلی کا ٹکڑا عنایت ہوتا تھا کہ دیکھو اس میں بہت باریک ایک دو کانٹے ہیں۔ نظر بھی نہیں آتے۔ ایک مدت بعد بڑی مشکل سے اُس خادم کی سمجھ میں آیا کہ مچھلی طلب حق کو کہتے ہیں اور کانٹے شک و گمان کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ویزاک کے ساحل پر آدم خور مچھلی جو بھینسے کے برابر ہوتی ہے آئی ہوئی ہے میں نے خود

اسے دیکھا ہے۔ ایک لڑکا جو تیرنے کی غرض سے گیا تھا ڑپ کر دیا بیچارہ گیا تھا نہانے اور مر گیا۔ ماں باپ روتے ہوں گے۔ ایک اور دفعہ ارشاد ہوا کہ سمندر جہازوں پر ہی پار کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی کے جہاز بھی پورے شہر کے شہر ہوتے ہیں۔ ان میں سنیما بھی ہوتے ہیں۔ کھیل کود کے سامان بھی، ناچ گانے بھی ہوتے ہیں۔ ہر کھانا ایک بڑی زوردار دعوت ہوتا ہے مسافروں کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم کس تیزی سے سفر طے کر رہے ہیں۔ چاہے وہ مسافر باورچی ہو یا بھنگی، تاجر ہو یا حاکم، سب کا سفر بڑے مزے سے کٹتا ہے، عیش و آرام میں کٹتا ہے صرف کپتان ہے کہ چوبیس گھنٹے چوکنا رہتا ہے اور ساری مخلوق جو جہاز میں ہوتی ہے ان سب کی ذمہ داری اور صحیح وسلامت ساحل تک پہنچانے کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ راستہ کے طوفان کی خبر زمین دوز چٹانوں کی احتیاط۔ غرض کہ منزل کی ساری راہ و رسم سے خوب واقف ہوتا ہے۔

ان سب باتوں کی کیا وضاحت کی جائے۔ ایک ایک لفظ ایک استعارہ ہے۔ سمجھنے والے کے لئے اس میں بہت کچھ ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ چودھویں صدی کا جہاز موجودہ زمانہ ہے اور

کپتان پیر کی ذات ہے۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نگل گئی تھی۔ پیٹ میں بڑی تاریکی بڑی گرمی اور بڑی گھبراہٹ ہو گی مگر جب ان کو ساحل پرلے جا کر اگل دیا تو ان کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا۔ اس ارشاد میں معرفت کا سمندر پار کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ بتایا گیا ہے۔ اکثر ارشاد ہوتا ہے "تمہیں حق کی تلاش کیا ہو گی جو حق کو تمہاری تلاش ہے"۔ بڑی مچھلی کا بہت ہی بڑا پیٹ ہوتا ہے اور چھوٹی مچھلیوں کی خود تلاش میں ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ بھوکی ہوتی ہے اور جہاں نظر آئیں ہڑپ کر جاتی ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں حق کی جستجو ہے مگر پیر کامل نہیں ملتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ میں کچھ بھی صلاحیت ہو تو آپ بچ نہیں سکتے، بھاگ کر چھپ نہیں سکتے۔ بڑی مچھلی ایک نہ ایک دن آپ کو ضرور کھا جائے گی۔ جہاز کا سفر خاص الخاص کے لئے ہوتا ہے۔ یہ عبودیت کا راستہ ہے۔ بندہ جب تک ساحل پر رہتا ہے دوپایا مٹی کا پتلہ ہی رہتا ہے۔ مگر کسی زبردست کے دامن کرم کے سہارے بڑے بڑے سمندر، سفر کی کاوش و تردد کے بغیر پار کر جاتا ہے۔ پیر کامل کی شفقت و محبت اور کرم کا کوئی کیا

اندازہ لگا سکتا ہے۔ یوں سمجھیں جیسے ایک ذات میں ستر ماں باپ ایسا دل پیر کامل ہی رکھ سکتا ہے۔

ایک دفعہ ۱۹۴۷ء میں ایک نووارد مہمان دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں پر جو گذر رہی تھی اس سے ان کو بڑا جوش تھا۔ معصوم بچے، پاک طینت عورتیں اور بوڑھے بے قصور سب گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے تھے۔ یہ نووارد اسی غم و غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ دستر خوان پر برس پڑے کہ آپ فقیر کہلاتے ہیں، کر کیا رہے ہیں۔ ان بے گناہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اور آپ ہیں کہ اپنی مستی میں مست گانے سن رہے ہیں اور تفریح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کیا آپ کا دل نہیں اور دل میں قوم کا کچھ بھی درد نہیں۔ بابا صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان تو وہی مسلمان تھے جو ایک مٹھی بھر ہزاروں پر بھاری ہوتے تھے۔ آج کیا بات ہے کہ ساڑھے چار کروڑ ڈر کے مارے بھاگ رہے ہیں اور اپنی اپنی جان بچانے سے بھی مجبور ہیں۔ یہ نووارد جواب دیتے ہیں کہ ایمان نہیں وہ ایمان جو حضرت علیؓ کی ذوالفقار تھی۔ وہ علیؓ جنہوں نے درِ خیبر کو اکھاڑا تھا۔ ایمان کیا چیز ہے۔ وہ کہاں سے ملے گا۔ وہ کیوں ناپید ہے۔ اس کے

جواب میں بابا صاحب فرماتے ہیں۔ انسان کیمیاوی نسخہ بھول گیا دیکھو میں تمہیں کیمیا کا نسخہ بتاتا ہوں۔ بڑا ہی سادہ نسخہ ہے یعنی صرف تیل، ہلدی اور مرچ۔ بس کل اتنا ہی کافی ہے۔ اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے۔

اس نووارد کو ایک دھکا سا لگا کہ میں بے گناہوں کے قتلِ عام کا رونا رو رہا ہوں اور یہ کیسے بزرگ ہیں۔ کیسی بے ربط اور بے معنی گفتگو کرتے ہیں۔ تیل، ہلدی اور مرچ کی بھی ایک ہی رہی۔ پھر مایوس ہو کر یہ نووارد خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا کر محفل خانے میں سو رہے تو۔ رات کے تین بجے بشارت کی کھڑکی کُھلتی ہے اور ان پر جو گزرتی ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اس بیان میں جویائے حق کے لئے سب اشارات ہیں۔ اور اس کو اس تلاش کے لئے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ سادات، زاہد و عابد و عامل رہتے ہیں۔ ساری عمر اللہ کی عبادت میں گزارتے ہیں۔ ہر قسم کی بدی سے پرہیز کرتے ہیں۔ انہیں محنت کی اجرت تو خدا ضرور دیتا ہوگا مگر دولت سرمدی سے اکثر دور ہی رہ جاتے ہیں۔ اور یہ بھی بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ڈاکو، شرابی کبابی اور فاحشہ عورتیں

جنہوں نے اپنی ساری عمر ظلمت اور گناہ میں صرف کی "ھُو" کی ایک تان میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ولی کامل ہو جاتے ہیں۔ آخر وہ کون سی چیز ہے اور کیا بات ہے جس کو دیکھ کر دیکھنے والا سب کچھ دیتا ہے۔ اس بات کا راز۔ اس راستہ کا پتہ جو اس بات تک پہنچائے ان ہی بظاہر تین بے معنی الفاظ یعنی تیل، ہلدی اور مرچ سے نکلتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے ہو گی۔ مگر زبان کی تنگ دامنی کی وجہ سے اس کی تشریح بھی اشارہ اور کنایہ میں ہو گی۔

کیمیائے سعادت

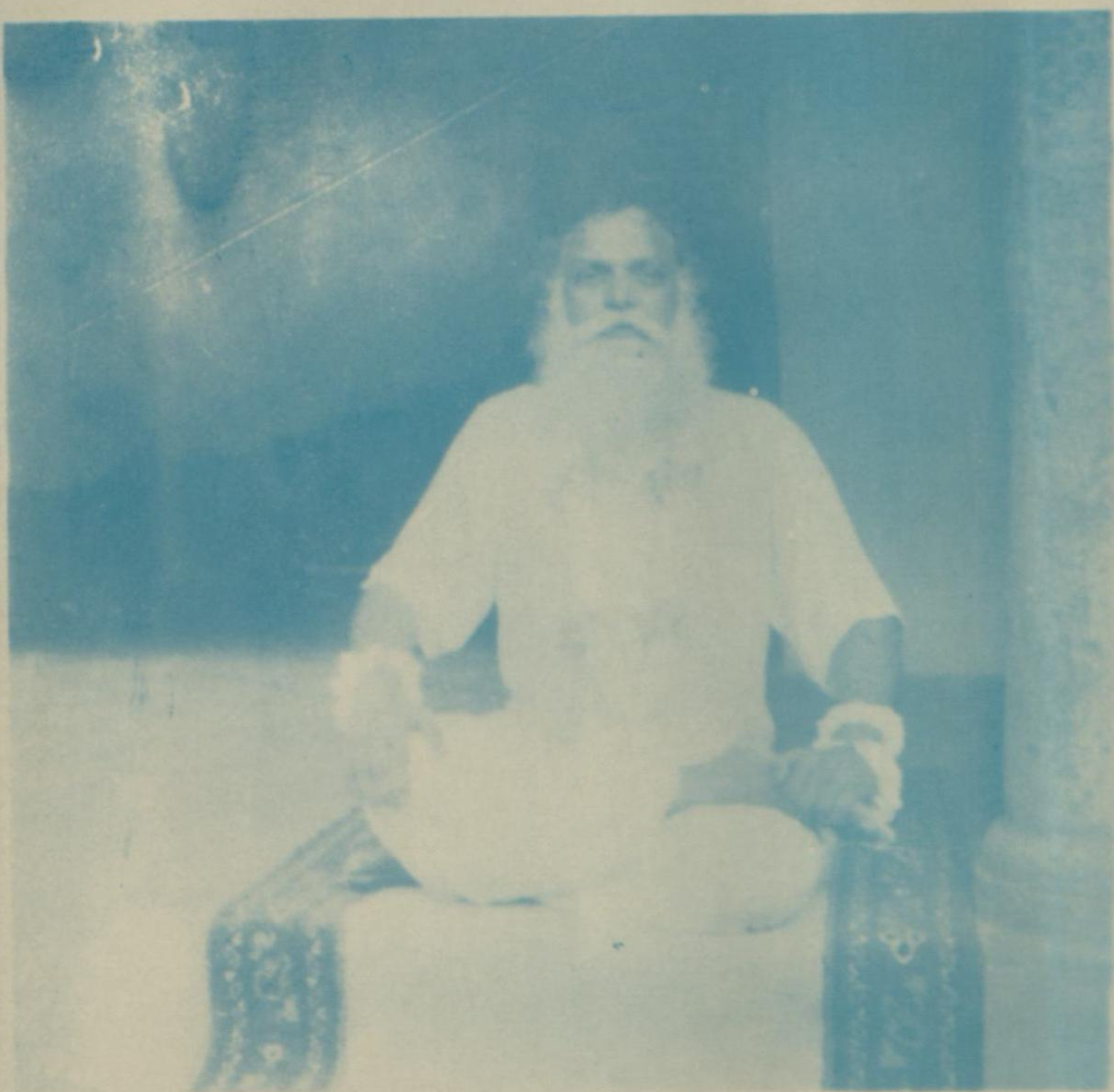
میں نے پروہت سے پوچھا کہ بشارت کی کھڑکی کیونکر کھلتی ہے۔ پروہت نے کہا۔ سادھو جی کسی زمانہ میں تمہیں کیمیا بنانے کا بڑا شوق تھا۔ تانبے کو پاک کر کے جاہت کو ٹھوس اور ملائم بنا کے اس کو رنگ کر سونا بنانے کا شوق تھا۔ مگر آج اس کیمیا کی بابت بھی سن لو جو ایک مٹی کے ڈھیر کو خالص سونا اور کندن بنا دیتا ہے۔

نگاہِ آن حکیمے نے نوازے
غبارِ رہ گزر را کیمیا کرد

قدرت کے اور رازوں کی طرح یہ راز بھی اس قدر سادہ اور آسان ہے کہ میں تمہیں بتاؤں تو تم کو یقین نہ آئے گا۔ مگر

تم مجھ پر یقین رکھو اور آزما کر دیکھو۔ صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ تیل، ہلدی اور مرچ۔ یہ حاصل کر لو تو صرف پھونکنے کی ضرورت ہو گی اور کیمیا بن جائے گی۔ تیل مقامِ تصوّف میں انسان کی صلاحیتِ عشق کو کہتے ہیں۔ یا اطبّا کی اصطلاح میں حرارتِ عزیزی کو۔

ہلدی انسان کی وہ صفت ہے جس کے بوتے پر اپنے کو کلیتاً دوسرے کے سپرد کر سکتا ہے۔ یہ عورت کی خصوصی صفت ہے۔ مرچ سے مراد عشق کے چار مقامات ہیں۔ عشقِ مجازی ملّت کا درد۔ شہادت اور غازی ہونا۔ اور پھونکنا مرشد کا حکم یعنی کُن فَیکُوْن۔



کیمیائے سعادت

کُن فَیَکُون

دلم مست شُد در ہوائے محمدؐ
چو آید نسیمے ز کوئے محمدؐ

سلامے کنم یا کہ بوسم قدم را
بہ ہر طرز باشم فدائے محمدؐ

نوید آمدہ در دیارِ غریباں
کہ تا خلق گیرد ردائے محمدؐ

علم گشت شمشیرِ غوثِ ولایت
یداللّٰہ در آبروئے محمدؐ

دلی کن فیکوں بہ کارِ جہاں است
کہ وارد ہنوز آرزوئے محمدؐ

(ولی‌الدین)

دردِ غمِ فراق کا درماں تم ہی تو ہو
اُجڑے چمن میں یادِ بہاراں تم ہی تو ہو

باطل کے معرکوں میں کیا عشق سربلند
مولا علی کا خنجرِ براں تم ہی تو ہو

رازِ الست کے ہوامیں تاجدارِ حق
مومن کے ذکر و فکر کا قراں تم ہی تو ہو

جنگاہِ خیر و شر میں ہو شمشیرِ بے نیام
دستِ خدا و قوتِ ایماں تم ہی تو ہو

ناموسِ آدمیت و شانِ ربوبیت
تفسیر درسِ لیس للانساں تم ہی تو ہو

نازل ہوا عبید کے سینے پہ یہ کلام
آیاتِ تاج الدین کا عنواں تم ہی تو ہو

خیبر کی وادیوں میں دُرّانی کو بھیج کر
ہنگامہ ہائے عشق پہ نازاں تم ہی تو ہو

راہِ طلب میں کھوگئی تھی زندگی مری
راہِ طلب کی منزلِ تاباں تم ہی تو ہو

دل فرطِ شوق سے سوئے قادر نگر رواں
اس بھولے بھٹکے راہی کا ساماں تم ہی تو ہو
بہتا تھا قطرہ قطرہ ان آنکھوں سے شوقِ دید
اب یم بہ قطرہ بر سرِ مژگاں تم ہی تو ہو

(رحمٰن بابا)

باب ۱۱

خلوت

سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم

خلوت کے راز و نیاز، عشق کی کہانی کی طولانی، اِس گہرائی کے اندھیرے میں بجلیاں۔ وہ حُسن کے بے پایاں کرشمے۔ وہ لطف و عنایات۔ وہ بربانِ ناز اور مقتول کا رقص۔ یہ دنیا ہی کچھ اور ہے۔ دل کے حجرے میں روح کی واردات ہیں۔ یہاں جزو کُل ہے اور کل جز۔ قطرے میں دریا ہے اور دریا میں سمندر۔ خلوت کے سانحات، احساسات تو کجا۔ ادراک کے بھی ماوراء ہوتے ہیں۔

"آنکھ دکھلا کر گئے ہیں جس نے "بیدم صف کے صف" ان آنکھوں کا جادو اور پھر کرم و احسان کی بوچھاڑ۔ عاشق تو اپنی ابتداہی میں ہوش گُم کر چکتا ہے جبکہ معشوق کو خود تم سے اور کہیں زیادہ عشق ہو تو پھر مَوت در مَوت ہو جاتی ہے۔ حُسن پر جب غم کا کیف چھاتا ہے۔ متوالی آنکھوں میں جب گلابی ڈورے

پڑجاتے ہیں۔ اور اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسّم ہوتا ہے۔

اک تبسم اک نگہ دزدیدہ اک تابندہ اشک

تو اللہ اللہ اس کے متعلق کوئی کیا لکھے اور کیا کہے۔ ہزار جان سے مر مر کے ان پائے ناز پر قربان اور پھر قربان ہونے کو دل تڑپتا رہتا ہے۔ اللہ اللہ اک عشق کی وارفتگی میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ مقاماتِ قدس و قرب۔ وہ عرش کی لطافتیں اور ملاقاتیں۔ کیا ان کا کوئی بیان کرے اور پھر جو اور پردے اٹھا دیئے جائیں۔ یہاں تک کہ سجدۂ نیاز قدموں کی طرف بڑھے تو بے نیازی کی اس ادا پر پھر ہزار ہزار جان سے کیوں نہ قربان جائیں کہ "تم کون ہو، یہاں کیوں ہو۔ اچھا خدا حافظ۔"

روشن از عکس جمالش عالم امکانِ ما
یک نگاہِ نازِ جاناں قیمتِ ایمانِ ما

کہہ کے اُنْفُسِکُمْ آگ لگا دے ساقی
ماسوا اللہ ہر اک نقش مٹا دے ساقی
خاک کے ڈھیر کو پھر رنگِ حقیقت دیکر
کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَانْ دکھا دے ساقی
یاد آ آ کے ہر اک آن ہر اک سانس کے ساتھ
دل کی اس آگ میں اور آگ لگا دے ساقی
مست آنکھوں کی قسم دے کے مجھے جامِ الست
خود ہی رگ رگ میں مری آگ لگا دے ساقی
ہو کے خود جلوہ فگن اپنے ہی آئینہ میں
اور دیوانہ کو دیوانہ بنا دے ساقی
پھونک کر ذات میں خود ذات کے اسراروں کو
آگ ہی آگ میں اک آگ لگا دے ساقی

(ولی الدین)

آپ اور آپکا ایک دِن   باب ۱۲

آئیے اب کچھ ہوش کی باتیں کریں۔ ایک تصور یا بت سے کسی ذات کا ادراک یا احساس مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ ذات تک صرف گرمیٔ عشق کی پختہ کاری سے اور اس کی تجلّی اور روشنی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہاں اس ذات کی صفات کا صرف ذکر ہی اس کے بغیر ممکن ہے۔ تو آیئے کچھ ذکر ہی کر کے بابا قادر اولیا کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

بابا صاحب کا قد ایسا ہے کہ دُور سے دیکھو تو معمولی اور درمیانہ معلوم ہوتا ہے مگر بازو میں کھڑے ہو جائیں تو اپنے سر سے بلند تر ایک سڈول اور گداز جسم نظر آئے گا۔ آپ کو کبھی مصافحہ اور قدمبوسی کرنے کا موقع ملے تو بابا صاحب کے ہاتھ اور پَیر آپ کو نرم ریشم کی طرح ملائم معلوم ہوں گے۔ کبھی راستہ چلتے یا سیڑھیاں چڑھتے اگر بابا صاحب کو ہاتھ کا سہارا دینے کا آپ کو موقع مل جائے تو اندازہ ہو گا کہ بابا صاحب کے جسم کی ساخت ہرن کی طرح سبک اور ہلکی ہے اور چال وہ مستانہ اور کیف آور کہ کوئی صرف دیکھ ہی

لے تو اس کو زندگی کی ساری عجلتیں اور رنگ و دو بے معنی معلوم ہونے لگیں۔ یہ چال ایک شیریں اور دھیمی آواز کا نغمہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اتنی تیز کہ آپ پیدل ساتھ سیر کو چلیں اور وہ اپنے اطمینان سے چل رہے ہوں تو بھی آپ کا بھاگ کر ساتھ ہونا مشکل ہو جائے گا۔

بابا صاحب کے مزاج میں انتہائی رحم دلی ہے۔ کوئی شخص کیسا بھی دُکھڑا سنا رہا ہو آپ ہمہ تن ہمدردی اور توجّہ ہوتے ہیں۔ آپ کی لوحِ جبیں پر ایک عجب تدبّر اور یقین پایا جاتا ہے جس کو دیکھتے ہی سُنانے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج میری مشکلوں کا حل مِل گیا اور میں کامیاب لوٹوں گا۔ صبر و استقلال کا یہ حال ہے کہ وہ لوگ جن پر حضور نے صدہا کرم فرمائے جب آپ کو ہر طریقہ سے بدنام کرنے کی اور ستانے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ کو ان کی یہ حرکات بتائی جاتی ہیں تو آپ کو دُکھ ضرور ہوتا ہے۔ مگر اتنا ارشاد ہوتا ہے کہ ابھی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ آپ ہی راہِ راست پر آجائیں گے۔ توکّل کا یہ عالم ہے کہ اکثر متموّل لوگ جب اپنی مرادیں پاتے ہیں اور عقیدت کی نذر کو کسی مستقل ذریعۂ آمدنی کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ



قیام

جو آج کا خدا ہے وہی کل کا بھی خدا ہے۔ اگر تم کچھ خرچ کرنا چاہتے ہو تو غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور ان کی امداد کرو۔ اس طرح جو نذرانہ ہوتا ہے اسی دن ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ شام کے کھانے کے بعد لنگر خانہ میں جھاڑو دے دی گئی ہے اور اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ اللہ اللہ کیفیت قلب سے نہ سہی خیال ہی میں اس توکّل کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ توکّل علی اللہ کی ظاہری تصویر ہے۔ باطنی تصویر اس سے ماورا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی نقدی موجود نہیں اور کسی حاجت مند نے نقدی کا سوال کر دیا تو ارشاد ہوا ہے "بیٹھ جاؤ اللہ مالک ہے۔" اور واہ رے شانِ توکّل کہ امید سے بھی زیادہ ہی ہوا ہے۔ جو بھی آپ کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے اسے جہاں اکل حلال میں سعی اور کوشش کی طرف توجّہ دلائی جاتی ہے وہاں یہ بھی حکم ہوتا ہے کہ صرف توکّل پر گزارہ کرو۔ امید و بیم سے ماورا ہو جاؤ۔ یہ بھی اکثر ارشاد ہوتا ہے کہ ضرورت سے کچھ کم عطا ہونا بھی خدا کا بڑا احسان ہے۔ اس حالت میں توکّل کے ذریعہ اپنے رشتہ کی شدّت اور ظاہری احساس قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اپنے ہر عمل کو اللہ ہی کے واسطے کرنے لگتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا مقام ہی وہ مقام ہے جہاں مردِ مومن کی ہر حرکت خیال اور احساس نہ صرف یہ کہ عبادت میں شمار ہوتے ہیں بلکہ ہمہ تن عبادت بن جاتے ہیں۔ بابا صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ توکّل ایک مرد کا کام ہے۔ ایک شیر دل کا کام ہے۔ بھوک کا روزہ کیا اور مجہول کی پارسائی کیا۔ جب 'میں' میں واقعی اتنی قدرت ہو کہ وہ اپنے ہر خیال کی تکمیل کر سکتا ہو اور پھر اس 'میں' کو 'تو' کے حوالہ کر دے اور کلیتہً حوالہ کر دے تب وہ توکّل کہلاتا ہے۔ فقیر میں جب اور چیزیں صحیح ہوں تو پھر وہ توکّل ہی پر اپنے دن کاٹتا ہے۔ توکّل کے راستہ سے انسان مقامِ رضا تک پہنچتا ہے۔ جب تک ہم اس سے راضی نہ ہو جائیں وہ ہم سے کیسے راضی ہو گا۔ اور جو وہ راضی ہو جائے تو عبودیت کا حق ادا ہو گیا۔ وعدۂ الست پورا ہو گیا۔

صبح کی پہلی روشنی پر کسی خادم کو حکم ہوتا ہے کہ دربار کی مٹکوں کی بتیاں بند کر دے۔ اس کے بعد وضو کے لئے پانی آتا ہے آپ نہایت اطمینان سے بڑی اچھی طرح وضو فرماتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رہتا ہے کہ یہ پانی درخت میں ٹھیک پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ کیا اچھی مثال ہے دیدۂ بینا کے لئے

قربان جائیے کہ حضوری میں بھی اپنوں کی تربیت کا خیال رہتا ہے یہ تو گویا ہر روز کی زندگی ہے۔ جب آپ حجرۂ مبارک میں تشریف لے جاتے ہیں، دروازہ کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور ایک خادم باہر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فرض نماز باآواز بلند ادا ہوتی ہے۔

اس کے بعد کا معمول یہ ہے کہ تسبیح پوری دھوپ کے نکلنے تک جاری رہتی ہے اور اگر کسی کو حجرۂ مبارک میں اس وقت بلا بھی لیا تو باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور ساتھ ساتھ تسبیح بھی رواں رہتی ہے۔ پھر باہر تشریف لے آتے ہیں۔ ایک ایک پودے اور درخت کو دیکھتے ہیں کہ پانی ملا یا نہیں۔ کتّے کو خادم نہلا کر لے آتے ہیں۔ ایک کتّے کا بچّہ ہوتا ہے جس کے ساتھ کبھی کبھی ایک نوعمر لڑکے کی طرح نہایت انہماک سے آپ کھیلنے لگتے ہیں۔ یہ کتّا کھیل کھیل میں کاٹ بھی لیتا ہے اور آپ کے جسم پر اس کے دانت کے نشان بھی پڑ جاتے ہیں۔ اگر یہاں پر اتفاق سے کوئی متشرّع آدمی موجود ہو اور اس کو دل ہی دل میں یہ بات ناپسند ہو تو خود ہی ارشاد ہوتا ہے کہ دیکھو جی کتّا تو ایک ناپاک جانور ہے۔ ہم تو نماز بھی پڑھتے ہیں اور ہمیشہ طہارت سے بھی رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے۔ اتنی بات تو ضرور

ہے کہ ہم آدم ہیں تو یہ گیدم۔ آدم کی ناف کی مٹی سے ہی تو اس کی تخلیق ہوئی ہے اور یہ کتا وفادار جانور ہے۔ انسان میں کم از کم اتنی وفا تو ہونی چاہیئے۔ یہ بیچارہ ہماری زبان بول تو سکتا نہیں مگر سمجھتا کچھ کچھ ہے اور صرف سونگھ کر ہی اپنے مالک کو ہر حال اور ہر روپ میں پہچان جاتا ہے۔ اپنے آپ کو مالک کا محافظ سمجھتا ہے اور اس بات پر اس کو بڑا ناز ہوتا ہے۔ ویسے در در کا ہو تو اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ مگر جب ایک در کا ہو جاتا ہے تو پھر ایک ہی کا ہو رہتا ہے۔ اس پر چاہے جتنی سختی کیجیے، بھوکا رکھیے، جو کچھ کیجیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل کی ایک ہی آرزو ہے اور وہ یہ کہ مالک کے قدموں سے دور نہ ہو۔ سامعین کے کچھ سمجھ میں آتا ہے اور کچھ نہیں۔ اس کا بھید تو بابا صاحب ہی جانیں کہ یہ کتے آخر کیوں پلتے ہیں اور کیا آپ ان باتوں میں دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس کو ایک غلام کی طرح پالا جائے۔ یا آپ اس جانور کی وفا کی قدر دانی کر کے اس کو اپناتے ہیں۔ یا کچھ خادموں کی عادتوں کی اس کھیل تماشہ کے ذریعہ اصلاح کی جاتی ہے۔ یہ بھید تو وہی جانیں۔

اس کے بعد آپ غسل فرما کر ایک گلاس میں تھوڑا گرم



تسبیح

پانی ملا ہوا دودھ اور شکر پی کر دربارِ عام کی طرف چل دیتے ہیں۔ کتا آگے آگے ہوتا ہے۔ مگر حجرۂ مبارک کے اندر کبھی نہیں جاتا۔ دروازہ کے باہر بیٹھا رہتا ہے۔

دربارِ عام میں لوگوں کا حال سُننے اور انہیں فیض عطا کرنے کے بعد آپ تھوڑی سی دیر کے لئے حجرہ مبارک میں جو دربار سے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر دربارِ عام میں تشریف لے آتے ہیں۔ دربارِ عام میں سے بھی کبھی کبھی آپ اچانک اٹھ کر حجرۂ مبارک میں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اور پھر لوَٹ آتے ہیں معلوم نہیں وہاں روحوں کو ملاقات کی عزّت دی جاتی ہے یا کچھ اور ہوتا ہے۔ اس دربارِ عام کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے بعد آپ اپنے اندر کے کمرہ کی طرف جاتے ہیں اور اس کے برآمدہ میں ایک تہہ ہو جانے والے پلنگ پر تھوڑی دیر کے لئے ستاتے ہیں۔ کبھی کبھی آنکھ بھی جھپک جاتی ہے۔ مگر گرمی ہو یا سردی۔ خدا جانے وہ کون سی آگ یا کوہ آتش فشاں ہے کہ ہمیشہ پنکھے چلتے رہتے ہیں۔ آپ اُٹھ کر تازہ وضو کر کے ظہر کی نماز اپنے ہی حجرے میں ادا فرماتے ہیں۔ کبھی ایک بج جاتا ہے کبھی دو، کبھی تین۔ اس کے بعد کھانا

چُنا جاتا ہے۔ دسترخوان کی گفتگو کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر ایک خاص بات یہ ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر چیز میں انتہائی دلچسپی، ہر لذت کی پوری پرکھ اور احساس رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کچھ سویّاں پک کر آئی تھیں۔ یہ بہت ہی خراب پکی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں لینے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوسیدہ کچے آٹے کے ڈلے ہیں۔ آپ نے ان سویّوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور غالباً آزمانے کے لئے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ یہ سویّاں کیسی پکی ہیں۔ پھر آپ نے کچھ سونگھا کچھ منہ بنایا اور دیکھتے رہے کہ کون کیا کہتا ہے۔ پھر دفعتاً یہ کہہ کر کہ رزق کی بے ادبی بڑا جرم ہے آنکھوں سے لگا کر نوش فرمایا۔ اس طرح ہر ہر اشارہ میں تعلیم و تربیت فرماتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دسترخوان سمیٹتے ہوئے خادم ہڈیاں طشت میں ڈال رہا تھا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ ایسا نہ کرنا یہ پھیکی پڑ جائیں گی تو کتا کیسے کھائے گا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد کافی دیر تک وہیں بیٹھے ہوئے دربار خاص کی کارگزاریاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر مجمع زیادہ ہو تو پھر دربار عام میں چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہجوم کم نہیں ہوتا تو بعد نماز مغرب

بھی دربار جاری رہتا ہے۔ جب تک سب کی دادرسی نہ ہو جائے۔ اکثر جب لوگ کم ہوں تو شام کے وقت یا کبھی صبح کے وقت اور خصوصاً جب کسی مہمان کو کچھ تبلانا ہوتا ہے تو آپ آس پاس کی پہاڑیوں اور باغات میں سیر کو نکل جاتے ہیں۔ ایک خادم ہاتھ میں درانتی لئے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور جو کچھ کانٹے اور جھاڑیاں راستہ کے اِدھر اُدھر بڑھ رہے ہوں، اُنہیں صاف کرتا جاتا ہے۔ آپ بڑی دلچسپی اور انہماک سے راستہ کی ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں۔ منظر، فضا، چرند، پرند، درخت غرض ہر چیز میں ایسی دلچسپی اور انہماک ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے یہ کام ہی آپ کا مقصد زندگی ہے اور شوق بھی اس شدّومد کے ساتھ دکھاتے ہیں کہ کیا کوئی چودہ سال کا لڑکا بھی جو پہلی دفعہ شہر کے اندھیرے مکان سے نکل کر جنگل جاتا ہو۔ اتنی دلچسپی اور زندہ دلی سے سیر کرتا ہو گا۔ یہ عمر، یہ مقام اور یہ ہوش۔ بس کچھ اللہ ہی کی دین ہو سکتی ہے۔ آپ اکثر فرماتے ہیں کہ جو کام بھی کرو چھک ہو کر کرو۔ یعنی آدھے دل سے کوئی کام نہ کرو چاہے کیسی ہی معمولی بات ہو مگر جب کرتے ہو تو دل و جان سے اپنے آپ کو جھونک دو۔ باغات میں پہنچے تو ایک ایک پھل کو غور

سے دیکھا۔ یہ کچا ہے، یہ پکا ہے، یہ پندا ہے۔ شاید پکنے سے پہلے ہی گر جائے۔ یہ درخت بڑا پرانا ہے۔ اس درخت کی جڑ میں سانپ کے بل ہیں۔ اس کنوئیں کا پانی بڑا میٹھا ہے۔ یہ پہاڑی نہر ہے مگر اس وقت خشک صرف ریت ہی ریت ہے۔ وہ دیکھو چیل کا گھونسلا ہے۔ کیا اونچا مقام ہے اور خدا جانے کیا کیا اسی قسم کے ارشادات ہوتے ہیں۔ بظاہر ہر بات اور ہر فعل اپنی جگہ صحیح اور موزوں مگر بہ باطن ہر لفظ اور اشارہ میں ایسے ایسے معنی ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ جو ہوتے ہیں ان میں سے جس کے لئے جو اشارہ ہوتا ہے وہ پکڑ لیتا ہے اور غوطہ زن ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک خادم کہیں دور سے یہ قطعی طے کر کے آیا تھا کہ یا تو پردہ اُٹھے یا میں پردہ ہو جاؤں۔ اس خادم نے یہ دیکھا کہ جب کبھی وہ اندر بیٹھک کی طرف جاتا ہے تو آپ صرف ایک تہبند باندھے بغیر بنیائن کے دھوپ میں بیٹھے ہوتے ہیں اور جیسے ہی یہ خادم پہنچتا ہے آپ اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر باندھ لیتے ہیں اور فرماتے ہیں ہمیں ننگا رہنے میں بڑی شرم آتی ہے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ چونکہ خادم اپنی ہٹ پر قایم تھا اس لئے روزانہ یہی بات دہرائی جاتی تھی

پھر کہیں پانچ چھ دن کے بعد خادم کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ اشارہ اپنی طلب کا جواب ہے اور ساتھ ساتھ حیا اور ایمان کا رشتہ بھی اس طرح سمجھ میں آگیا گویا اندھیری رات میں بجلی کوند گئی اور سارا منظر ایک آن میں روشن ہو گیا۔ خادم نے آنکھیں نیچی کر لیں اور بھی بہت تھے مگر جس کی طرف جو اشارہ ہوتا وہی اس کو سمجھ سکتا۔ کیونکہ بات بہت معمولی، سادہ اور روزمرہ کی ہوتی تھی۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب تک وہ خاص بات جو سمجھانا مقصود ہو سمجھ میں آ جائے تو بیسوں بار دہرائی جاتی ہے اور جب سمجھ میں آگئی تو اس کا ذکر بھی نہیں ہوتا۔

رات کا دربارِ عام جب ختم ہو جاتا ہے تو آپ کمرہ کی طرف لوٹ آتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے پھر ستا لیتے ہیں۔ اکثر دربارِ عام میں رات کے گیارہ بارہ اور کسی نیاز اور جلوس کے زمانہ میں تو دو اور تین بھی بج جاتے ہیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ سب لوگوں کو کھانا کھلانے کے بعد آپ عشا کی نماز ادا کر کے کھانے پر تشریف لاتے ہیں۔ کھانے کے دوران میں ہی کبھی کوئی پرانے بزرگوں یا پیغمبروں کا قصہ کسی نے چھیڑ دیا تو آدھا گھنٹہ گزر جاتا ہے اور ہاتھ میں

کئے جاتے ہیں اور مستقبل کے کون کون سے نقشے کھینچے جاتے ہیں

گرمیوں کا موسم آتا ہے۔ اپنی "ھُوھا" کو ساتھ لئے ہوئے گزر جاتا ہے۔ بارش کی بہاریں آتی ہیں۔ خشکیاں جل تھل ہو جاتی ہیں۔ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ موسم بھی اپنے پھول اور ثمر لئے گزر جاتا ہے۔ پھر سردیوں کی لمبی لمبی راتیں، دھوپ کی خوشگوار کیفیتیں۔ زندگی کے یہ پُرسکون دن اور رات بھی آتے ہیں اور اپنی گود دی بھر کے چلے جاتے ہیں۔



تشہد

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ

قادر ہے سراپا شمعِ جہاں سُبحان اللہ سُبحان اللہ
ہے اس سے منور کون و مکاں سُبحان اللہ سُبحان اللہ
وہ داتا، خواجہ، محی الدین، وہ صابرؔ نظام فریدالدین
انوارِ ادائے تاج الدین سُبحان اللہ سُبحان اللہ
وہ نورِ سمٰوات و والارض، وہ نورِ مجسّم لاثانی
خود ظاہر و باطن روشن ہے سُبحان اللہ سُبحان اللہ
آپ اپنے مقابل اُترا ہے اور رُوپ اچھوتا سا لے کر
کیا شان نرالی وحدت کی سُبحان اللہ سُبحان اللہ
اس جذب و شوق و مستی میں، اس عشق دائم منزل میں
وہ دائم، قائم قادر ہے سُبحان اللہ، سُبحان اللہ
محبوبِ دوعالم بن کے جب اُترا ہے ضمیرِ فطرت میں
خود حق نے کہا ہے صَلِّ علیٰ سُبحان اللہ سُبحان اللہ
ہر دل کی نازک دھڑکن سے پیغام اسی کا آتا ہے
ہر سانس اسی کا گہوارہ سُبحان اللہ، سُبحان اللہ

ہر روپ اسی کا نقشہ ہے، ہر رنگ اسی کا مظہر ہے
اللہ احد، اللہ اصمد، سبحان اللہ، سبحان اللہ

خود لا ہے صورت سبحان کی اور لا کے پردہ میں اللہ
یہ لا الہ کا رمز ولی سبحان اللہ، سبحان اللہ

(ولی الدین)

ماہِ کنعاں شاہِ خوباں یافتم
از لقائش رمزِ ایماں یافتم
خوش نصیبم کوئے جاناں یافتم
پائے ساقی حدِ امکاں یافتم
تازہ پیکاں تازہ پیماں یافتم
نقد جاں بسیار ارزاں یافتم
اے ولی چوں مہر سلطاں یافتم
دو جہاں گل بد اماں یافتم

(ولی الدین)

قادر کے سراپا میں نہاں اور ہی کچھ ہے
ان بھولی نگاہوں سے عیاں اور ہی کچھ ہے
ہر دیکھنے والے کی نظر دیکھ رہی ہے
ہر دیکھنے والے کا گماں اور ہی کچھ ہے
زاہد نے چھپا رکھا ہے کعبے میں خدا کو
اللہ کے کعبے کا نشاں اور ہی کچھ ہے
تسلیم و رضا عجز و طلب شوق فراواں
طالب کی تگ و دو کا جہاں اور ہی کچھ ہے
ہر لحظہ نیا ذوق، نئی جرأتِ دیدار
یہ تشنگیٔ زندہ دلاں اور ہی کچھ ہے
آفاق میں کھو جاتے ہیں آفاق کے بندے
زندوں کا زماں اور مکاں اور ہی کچھ ہے
کہنے کو تو کہہ دیتے ہیں الفاظ بہت کچھ
بہتے ہوئے اشکوں کی زباں اور ہی کچھ ہے

(رحمان بابا)

باب ۱۳
سیر

بابا صاحب قریب کی پہاڑیوں اور باغات میں اکثر سیر کے لئے پیدل چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص موٹر یا بس لے آئے اور اس پر سوار ہونے کی درخواست کرے تو کہیں دُور کا سفر اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ خادموں کے لئے بڑی خوشی کا موقع ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ ابھی باطن کی سَیر سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے اور ظاہر کی سَیر میں تفریح ہو جاتی ہے۔ صبح سویرے بعد نمازِ فجر عموماً چل دیتے ہیں۔ اگر موٹر پانچ کی گنجائش والا ہو تو کم از کم دس ساتھی ضرور ہوتے ہیں۔ بابا صاحب کسی کا بھی دل دُکھانا نہیں چاہتے۔ خواہ آپ کو لمبے سفر میں جکڑے ہوتے اور سکڑے ہوئے بیٹھنے کی تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ موتی نامی کتّا روزانہ تو نہایت سنجیدہ اور متین رہتا ہے۔ مگر ایسے دن اس کی خوشی اور اچھل کود دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ چاہے اس کو کتنا ہی زنجیر میں باندھیں وہ لڑ جھگڑ کر سب سے پہلے بہترین سیٹ پر جا کر اِس



سیر

اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے کہ گویا سارا انتظام اسی کی خاطر ہوا ہے۔ راجو ماسٹر صاحب جن کی عمر تقریباً پچھتر سال کی ہوگی اور جو چلنے سے قدرے معذور ہیں وہ بھی ایسے سفر سے نہیں چوکتے اور خوب پہاڑیوں اور جنگلوں میں پیدل چلتے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے تین سفروں کی تفصیل درج ہے جو اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور جن میں آیاتِ قرآنی کی طرح اشارے اور نشانیاں ہیں۔

اسحٰق پٹنم :۔ یہ بندرگاہ وجے نگرم سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے اور بے انتہا خوبصورت جگہ ہے۔ ساحل پر سب پہاڑیاں ہیں اور اِن پہاڑیوں کے درمیان شہر واقع ہے اور بالکل پہاڑیوں کے دامن میں سمندر۔ اسی وجہ سے یہاں کا سمندری ساحل بھی بہت گہرا ہے اور بڑے بڑے جہاز بالکل اندر تک آجاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر حضرت اسحٰق مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اور چلّہ گاہ ہے۔ یہ ایک عجیب پُر سکون اور پُر فضا جگہ ہے۔ رات کے وقت اگر یہاں قیام کیا جائے تو حجرے کے اندر گہرے سمندر کا شور اپنے اندرونی ولولے اور جوش سے کچھ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

موٹر میں سوار ہو کر حضور بابا صاحب، دو چار خادم اور ایک دو مہمان شام کے وقت چلتے ہیں۔ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ چاند کی منجھلی تاریخ ہو۔ موٹر سیدھی لبِ ساحل جا کر رُکتی ہے۔ نہایت ستھری اور صاف ریت پر سمندر کا نظارہ عجب بہار دکھاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر نے چاند کا سارا جمال اپنے اندر سما لیا ہے اور اس کے دل کی دھڑکنیں موجیں بن بن کر ساحل پر نثار ہو رہی ہیں۔ روپہلی چادر میں اونچی اونچی موجوں کا سماں کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ گویا آسمان پر تو ایک چاند ہے مگر زیرِ آسمان اس سارے سمندر کی ایک ایک موج اپنے دل کی وسعتوں کو پھیلا کر ایک ایک چاند کو لپیٹے ہوئے ہے۔ یہ موجیں کیسی شان سے اُٹھتی ہیں۔ ساحل کی طرف بڑھتی ہیں اور ساحل سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اپنی احاطہ بندی سے احتجاج کر رہا ہے اور اپنے جذبہ کو یوں نشر کر رہا ہے۔

چودھویں رات کے سمندر کا منظر باطن میں عجب کیفیت پیدا کرتا ہے جس طرح آسمان اپنی عظمت کی انکساری میں سرنگوں ہو کر حدِ نظر تک زمین سے آملتا ہے اور پھر اس کا نیلگوں عکس اس نیلگوں

پانی میں کچھ اس طرح مل جاتا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ زمین کون سی ہے، آسمان کون سا ہے اور کس کے رُخِ روشن کی کون آئینہ برداری کر رہا ہے۔ اسی طرح آج کی رات سمندر کا منظر اور اس کے شور سے ظاہر و باطن کا پردہ دور ہو جاتا ہے اور ھوالظاہر ھوالباطن کے ایک ہونے کی دل شہادت دیتا ہے۔ یہ شورش، یہ احتجاج، یہ سربلند موجیں، یہ موجوں کی سرفروشی سب کچھ صرف لبِ ساحل ہے۔ سمندر کی طرف آگے نظر بڑھاؤ تو سمندر کے وسط میں سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ سمندر کا ظرف ہے اِس قدر وسیع اور عمیق۔ اس میں کوئی بھی چیز ڈال دیجیے تو تھوڑی دیر کے بعد ذرا سی جگہ بدل کر وہ باہر نکال دی جاتی ہے۔ سمندر میں دنیا بھر کی گندی چیزیں ڈال دی جائیں مگر اس کا پانی ہمیشہ پاک ہی رہتا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو اس کے اندر پہنچے اس کو بھی پاک کر دیتا ہے ہر جاندار چیز جب بے روح ہو جاتی ہے تو اس کے قالب کے اجزاء ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر ہی میں پہنچتے ہیں اور سمندر ہی سے ابتدائے زیست ہوتی ہے۔ خشکی کے رہنے والے سمندر میں اپنے پَیر بھگونے سے جھجکتے ہیں۔ مگر جیسے ہی سمندر کے قریب پہنچتے ہیں لاکھ اپنے دامن کو بچانے کی کوشش کریں تب بھی ایک نامعلوم موج ایسی آتی ہے کہ وہ

خواہ شاد ہوں یا ناشاد بھگو ہی دیتی ہے اور لوٹتے ہوئے ان کے پیروں تلے سے ایسی زمین کھسکتی ہے کہ گرنے اور بہہ جانے سے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے بچاتے ہیں۔ پھر چودھویں رات کا طلسم ایک کرشمہ ہوتا ہے۔ اس دن سمندر جوش پر ہوتا ہے یہی حال بزرگانِ دین کے عرس کے موقع پر دیکھا گیا ہے۔ عقیدتمند تو اپنی نیازمندی سے چاہے اور کسی موقع پر بھی فیض حاصل کر لیں مگر عرس کے دن بلا امتیاز و تفریق ہر ایک فیضیاب ہوتا ہے۔

اسحٰق پٹنم کے سمندر کے کنارے ہم لوگ پالتی مار کر بابا صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ ہر ایک اپنے حال میں غرق تھا۔ معلوم نہیں سمندر کی تہہ میں موتیوں کی تلاش تھی یا سمندر کی گہرائی معلوم کرنے کی۔ سمندر بھی خاموش تھا اور ہم لوگ بھی خموش۔ یک لخت بابا صاحب کھڑے ہو گئے اور سر پر دونوں ہاتھ ملائے ہوئے سمندر کی طرف رُخ کر کے بالکل ساکت ہو گئے۔ آدھ گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا۔ خدا معلوم یہ سر پر دونوں ہاتھ رکھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا کوئی ذمہ داری ہے جس کا بوجھ اٹھانا وہ بخوشی قبول کر رہے ہیں۔ اب وہ خادموں کی طرف رُخ کرتے ہیں اور

باتیں ہوتی ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ ساحل سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر جہاز لنگر ڈالے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں بجلی کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر میں دو مضبوط قلعے ہیں۔ بابا صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ ایک اور جہاز آنے والا ہے۔ وہ کاکی ناڈا سے آرہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے بہت سے بندرگاہ ہیں مگر سمندر ہر جگہ ایک ہی ہے۔ کہیں سمندر اوتھل ہے کہیں گہرا۔ گو لوگوں نے نام مختلف رکھ چھوڑے ہیں۔ یہ جہاز یوں تو قریب نظر آتے ہیں مگر ہیں بہت دور سطح سمندر پر فاصلہ کا اندازہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔

اسی قسم کی پُرمعنی گفتگو ہوتی رہی۔ اپنے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق سامعین گوہرِ معنی سمیٹتے رہے کہ تھوڑی دیر کے بعد دُور سے وہ تیسرا جہاز نظر آیا اور اشارہ ہوا دیکھو دیکھو وہ آگیا آگیا۔ اور دیکھتے دیکھتے اس جہاز نے قدرے فاصلہ پر لنگر ڈال دیا۔ یہ تین جہاز اور ان میں بجلی کے قمقمے یہ سمندر اور یہ ساحل واللہ اعلم کس چیز کی طرف اشارے تھے۔ اس جگہ نزول و قیام کس لئے تھا اور اس خاموشی میں کیا ہوا۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ پھر لبِ ساحل حضور چلنے لگے اور خادم بہت سے

پیچھے پیچھے۔ ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ سمندر میں سے ایک چٹان بڑھ کر آگے کو نکلی ہوئی تھی اس پر چڑھ گئے۔ یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کس طرح رقیق پانی اپنے استقلال اور پیہم کوشش کی بدولت ان سخت چٹانوں کو گلا گلا کر ان کے اندر گھس آیا ہے اور وہ سارے نوک دار کونے گل گل کر ختم ہو گئے ہیں محبّت کا بھی یہی حال ہے دشمن کتنا ہی سخت ہو کافر کتنا ہی سیاہ قلب فقیر کی محبّت کا جوش ہر ایک کو اپنا لیتا ہے

یقیں محکم عمل پیہم محبّت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

شہر میں خبر ہو گئی کہ باباصاحب تشریف لائے ہیں۔ کچھ لوگ موٹروں پر آئے۔ باباصاحب سے ملاقات کی۔ کچھ مٹھائی اور چائے تقسیم ہوئی۔ اس کے بعد واپسی کے لئے سب لوگ موٹروں پر سوار ہو گئے۔ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ چاندنی میں سامنے کا منظر ایسا نظر آتا تھا کہ یہ امتیاز دشوار تھا کہ یہ خواب کی کیفیت ہے یا ہوش کی۔ نرم چاندنی میں ساری زندگی کی سختیاں ملائم دکھائی دیتی ہیں جیسے کسی حسین کے فیضِ محبّت سے ہر چیز بخوشی و رغبت گوارا ہوتی ہے چاندنی ہی چاندنی۔ دل میں سمندر کا سا جوش۔ اب من و تو کی کشمکش توحید

کی وحدت میں غرق معلوم ہوتی ہے۔

کلنگ پٹنم - یہ ایک دوسرے سفر کا ذکر ہے۔ ابھی رات شروع ہوئی تھی اور اندھیری رات تھی۔ سات آٹھ بجے کا وقت تھا کہ موٹر پر سوار ہو کر کلنگ پٹنم کو جو کہ ستر میل کے فاصلہ پر ہے، روانگی ہوئی۔ یہ بندرگاہ کسی زمانہ میں کافی عروج پر تھی مگر اب بالکل ویران ہے بس ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔ اس جگہ کی اہمیت صرف ایک بزرگ کے مزار کی وجہ سے ہے یہ بزرگ کوئی آٹھ صدی پہلے یہاں آئے تھے۔ یہ بارہ بھائیوں میں سے ایک بھائی تھے جو اور سب کے سب شہید ہو گئے تھے۔ غالباً یہ بھائی مدینہ منورہ سے جہاز پر تشریف لائے تھے اور راس مشرقی ساحل پر مع اپنے حلقوں کے پھیل گئے تھے۔ ان شہیدوں کے مزارات مدراس سے لے کر اڑلیسہ کے ساحل تک اب بھی موجود ہیں۔ موٹر کو روک کر اس مزار شریف کے مجاور کو اطلاع دی گئی۔ مجاور چابی اور روشنی لے کر ایک نزدیک کے راستہ سے مزار پر پہنچ گیا۔ اور ہم لوگ ریتیلے راستوں سے موٹر کے ذریعہ پہنچے۔

یہاں ایک چھوٹا سا ناریل کا باغ ہے اور اس کے درمیان ایک عمارت ہے۔ جو آدھی سے زیادہ ریت سے ڈھک گئی ہے۔

سیڑھیوں سے اتر کر ہم مزار کے اندر پہنچے اور جو اگر بتیاں ساتھ لے گئے تھے ان کو جلایا۔ یہ مزار تقریباً بیس اکیس فٹ لمبا تھا۔ اور اوپر چادر پڑی ہوئی تھی۔ حضور بابا صاحب نے چادر کو اٹھایا ایک خادم کو بلا کر اس کے ہاتھ میں چادر دے کر فرمایا کہ یہ دیکھو مزار کتنا لمبا ہے۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے کہ یہ بزرگ اس قدر لمبے تھے۔ حقیقت میں یہ دو قبریں ہیں۔ آپ کی اور آپ کے مرید کی جو آپ کے پائنتی دفن ہے۔ دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اس جگہ کو خوب گھوم کر دیکھو۔ اندر تہ خانے میں ان بزرگ کے گھوڑے کا بھی مزار ہے۔ جو اسی جہاد میں آپ کے ساتھ شہید ہو گیا تھا۔ سب لوگ گھومنے کے بعد اوپر نکل آئے اور موٹروں میں سوار ہو کر واپس جائے قیام پر پہنچ گئے۔ مزار پر مشکل سے پندرہ منٹ رُکے ہوں گے۔ یہ ایک سو چالیس میل کا سفر، اندھیری رات، نہ کوئی راستہ کی تفریح، نہ کوئی دلفریب منظر۔ آخر صرف چند منٹ کے لئے وہاں کھڑے ہو کر لَوٹ آنا کیا معنی رکھتا ہے۔

اگر اس روح سے ملاقات کرنی تھی تو کیا روحیں جو زندگی میں جسم میں مقید رہتی ہیں۔ انتقال کے بعد قبر میں مقید رہتی ہیں؟

یہ تو کچھ بعید از قیاس بات معلوم ہوتی ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر بزرگ انتقال کے صدیوں بعد ظہور میں آتے ہیں، اور ان کا فیض جاری ہو جاتا ہے۔ کیا یہ کچھ ایسی ہی بات تھی خدمتِ خلق کے لئے کیا کسی کو جگانا مقصود تھا یا جو خادم ساتھ تھے ان کی تعلیم مقصود تھی کہ دیکھو قرونِ اولیٰ کے فقیروں نے کس طرح اسلام کا عَلَم بلند کیا۔ حق کی خاطر جہاں ما وشما کو آغوشِ محبت میں لیا وہاں باطل کو مٹانے کے لئے اللہ کے واسطے ہاتھ میں تلوار بھی اٹھائی اور شہادت پا کر حیاتِ جاوید حاصل کر کے نہ صرف اپنی ہی دوامی عمر پائی بلکہ جس نصب العین کی خاطر اپنی جان دی اس نصب العین کو بھی حیاتِ جاوید بخش دی۔ کہتے ہیں مرتے وقت انسان کا جو حال ہوتا ہے وہی حال انتقال کے بعد برقرار رہتا ہے۔ اگر انسان کو دنیا اور دنیا کی دولت و عظمت کھینچے ہوئے ہے اور مرتے وقت انہی چیزوں کی یاد اور کشمکش میں جان نکل جائے تو روح بھٹکتی پھرتی ہے کیونکہ اس کو دنیا سے جو لگاؤ رہ گیا ہے اسے پورا کرنے کے لئے عالمِ ارواح میں کوئی سامان نہیں میسر آتا۔ اور شہید جب حق کے واسطے اپنا سر کٹاتا ہے اور اس کی گردن سے گرم خون جوش مارتا ہوا حق کے نعرے لگاتا ہے تو اسی زمین سے جس نے اس خون کو چوسا کبھی نہ بجھی

کوئی مردِ مومن اُٹھ کر پھر سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔ کیا اس قسم کی کوئی تعلیم ان بزرگ کے مزار کے ذریعہ دینی منظور تھی یا عشق و محبّت کے کسی رمز کی طرف کوئی اشارہ تھا۔ اللہ اللہ وہاں اس پندرہ منٹ کے قیام کے لئے تکلیف کے ساتھ اتنا لمبا سفر اختیار کرنا ضرور کچھ نہ کچھ رمز رکھتا ہوگا۔

نارائن پٹنم۔ جب اس مقام کی طرف سفر ہوا تو اتوار کا دن تھا اور مئی کی چوبیس تاریخ۔ گرمی شباب پر تھی۔ یہ ایسا دن تھا جسے اگنی کارتی کا دن کہا جاتا ہے۔ دکن میں یہ چودہ دن سخت گرمی کے ہوتے ہیں اور اس زمانہ میں اتنی گرمی پڑتی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اگر چٹانیں پھٹ جاتی ہوں تو عجب نہیں۔ بابا صاحب قبلہ اور ہم لوگ اس دن نو بجے کے قریب موٹر میں سوار ہو کر نارائن پٹنم کے سفر کے لئے چل دئے۔ وجے نگرم سے جنوب و مغرب میں بیاسی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں گھنے جنگل ہیں جن میں شیروں اور اژدھوں کی سلطنت ہے۔ اونچی اونچی پہاڑیوں، دشوار گذار گھاٹیوں اور بغیر پل کے کئی دریاؤں میں سے گزر کر اس جگہ پہنچا جاتا ہے۔ نارائن پٹنم جانے کا سلسلہ غالباً یوں ہوا کہ بابا صاحب قبلہ کے والد بزرگوار کے ایک دوست

وہاں جنگل کی پیداوار کی تجارت کی غرض سے مقیم تھے جب باباصاحب کی عمر دس سال کی تھی تو آپ کی گائے کو جو سوکھ گئی تھی اس جنگل میں چرا کر تازہ کرنے کے لئے بھیجدیا گیا تھا۔ جب وہ تازہ ہوگئی تو آپ کے والد محترم کے دوست نے اس گائے کو جنگل کے چند آدمیوں کے ساتھ معہ کچھ اس جگہ کی پیداوار کے آپ کے پاس بھیجدیا۔ باباصاحب کے یہاں جنگل کے ان مہمانوں کی خوب خاطر مدارات کی گئی تھی۔ ان لوگوں کو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور چاول بہت پسند تھے یہ خرید کر دے دیئے جاتے تھے اور وہ ان کو پکا کر کھاتے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے کئی دن قیام کیا تھا۔

اس واقعہ کو گزرے چالیس سال ہو چکے تھے۔ شاید دل میں یہ خیال رہا ہو گا کہ اس جگہ کو ضرور دیکھنا چاہیئے جو ہزاروں برس سے بغیر کسی تغیّر کے چلی آرہی ہو گی وہ جنگل کے درندے، اور اژدھے، وہ فطرت کی ظالم طاقتیں اور ان میں ان سیدھے سادے انسانوں کا اپنی نسل کو قایم رکھنا ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ صفحوں میں کئی بار اشارہ کیا گیا ہے' پیر کامل کا ہر کام اور اس کی ہر بات معنی در معنی رکھتی ہے' اس بلا کی گرمی یعنی اگنی کارتی میں تین دن ایسے ہوتے ہیں کہ دن کے وقت ایک

چڑیا تک حرکت نہیں کرسکتی۔ سڑکیں خالی ہوتی ہیں تمام لوگ گھروں میں بند ہو جاتے ہیں اور گرمی اور دھوپ سے چھپنے لگتے ہیں۔ اور ہم تھے کہ برستی آگ میں عازمِ سفر ہوئے۔ پچاس میل پکی سڑک پر وہاں جانا تھا جہاں پاربتی پور ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا۔

اس شہر تک پہنچنے سے پہلے ہی بائیں ہاتھ کو سڑک مڑتی ہے جو پہاڑیوں اور جنگل میں نکل جاتی ہے۔ یہاں سے تیس میل پر نارائن پٹنم ہے۔ سڑک اتنی خراب ہے کہ موٹر کا سفر تو کیا بیل گاڑی پر بھی گزرنا مشکل ہے مگر ہم ہیں کہ دھکے کھاتے لوٹتے پٹتے لشتم پشتم چلے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے دن بڑھ رہا ہے گرمی کی شدت تیز ہوتی جاتی ہے۔ پیاس کے مارے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں، اور ہم ہیں کہ ایک کالے رنگ کے بند موٹر میں بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ موٹر سے دس میل کے فاصلہ پر ایک کافی چوڑی ندی میں تقریباً گھٹنے گھٹنے پانی ہوگا۔ اس ندی کے پاس ہی ایک کیت کے درخت کے نیچے موٹر روک دی گئی تاکہ ذرا سستا کر اور پانی پی کر آگے روانہ ہوں۔

دن کے بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ ایسی سخت لُو چل رہی تھی کہ الامان الحفیظ۔ جتنا پانی ساتھ تھا وہ اس قدر کھول رہا تھا کہ

پینے کا تو کیا ذکر منہ میں لیتے ہی قے ہو جاتی۔ ندی میں جا کر دیکھا تو وہ پانی بھی اس قدر کھول رہا تھا کہ پیر تک نہ ڈالا جاتا تھا۔ صرف موٹر ہی نہیں بلکہ اندر کی گدّیاں تک ایسی تپ رہی تھیں کہ بیٹھنا مشکل تھا۔ باہر کوئی سایہ دار درخت بھی نہ تھا جس کے نیچے پناہ لے سکیں۔ طرفہ تماشہ یہ کہ گرمی کے مارے سب لوگوں کو دست آنا شروع ہو گئے۔ ندی کے پاس تپتے ریت میں بھاگ بھاگ کر جاتے تھے اور فارغ ہو کر آتے تھے۔ اللہ کی پناہ، حشر کے میدان میں شاید اسی قسم کی حالت ہو گی۔ بیچارہ موتی جس کی لمبے لمبے گھنے بال تھے، بہت پریشان اور بے حال تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ہم لوگ اس درخت کے نیچے رُکے رہے۔ کچھ دہی ساتھ تھا جس کو اسی گرم پانی میں گھول کر پی لیا۔ آگے بڑھنے کی ہمّت کچھ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی کہ ڈرائیور نے اطلاع دی کہ پٹرول تو صرف دس میل تک کے لئے کافی ہے۔ لوٹ کر پاربتی پور تو پہنچ سکتے ہیں مگر آگے بڑھے تو بیچ جنگل میں رُک جائیں گے۔ ڈرائیور کی اس کوتاہ اندیشی پہ جو غصّہ آیا اس کا کیا بیان کیا جائے۔ بابا صاحب خاموش تھے نہ کچھ ادھر کی کہتے تھے نہ اُدھر کی۔ خدّام نے جوں توں کر کے بابا صاحب کو گاڑی میں بٹھایا اور موٹر پھر واپس لوٹی۔ وجے نگرم کوئی سولہ

میل رہ گیا تھا کہ موٹر کا ایکسل ٹوٹ گیا اور کار سڑک پر ہی رُک گئی۔

واپسی میں بھی ہر ایک کا بُرا حال تھا۔ موتی بیچارے کا کچھ نہ پوچھئے تقریباً سارا وقت قبلہ بابا صاحب کی گود میں ہی بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے جب وہ کسی اور کی گود میں آ گیا تو بابا جان نے اپنے جبّۂ مبارک کی طرف اشارہ کیا جس پر کتّے کی غلاظت کے پیلے پیلے داغ لگے ہوئے تھے۔ وہی بابا جان جن کی نفاست طبع، پاکیزگی اور ستھرا پن ضرب المثل ہے۔ بظاہر ان کی طبیعت پر اس غلاظت سے کوئی مَیل نظر نہ آتا تھا اور چہرۂ مبارک پر ذرہ برابر کراہیت یا بیزاری نہ تھی۔ ان بزرگانِ دین کے ظرف کو کوئی کیا پا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بس کو روکا گیا اور اس میں سوار ہو کر مغرب کے وقت سب لوٹ آئے۔ کوئی کھانا کھانے کے لئے دوڑا تو کوئی بدحال ہو کر پانی پی کر سو رہنے کے لئے۔ مگر بابا صاحب غسل فرما کر پھر ویسے کے ویسے اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔

اس واقعہ کو پورے تئیس دن گزر جاتے ہیں کہ پھر نارائن ٹیمبم جانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ اب مانسون کی بارشیں شروع ہو گئی تھیں اور ہر طرف سبزہ نظر آتا تھا۔ ساری فضا اور جنگل دُھل کر تازہ اور شگفتہ ہو چکے تھے۔ راستہ چونکہ خراب تھا اس لئے دو

جیپ کاروں کا انتظام کیا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ بارش کا موسم ہے۔ اگر ان پہاڑی ندیوں میں پانی آگیا تو ان کو پار کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اگلے دن یعنی سترہ جون کو صبح سویرے چلنے کا عزم تھا اور گاڑیاں تیار کی جا رہی تھیں کہ سولہ کی شام کو دفتر موسمیات سے خبر ملی کہ اگلے دو دن میں سخت بارش اور طوفان کا احتمال ہے۔ آسمان ابر سے گھرا ہوا ہے اور بارش شروع ہو چکی ہے۔ راستہ کا یہ حال تھا کہ جو چوڑی ندیاں تھیں ان پر پل نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ عام طور پر علم تھا کہ ندیاں اپنے جوشیلے دھاروں کی وجہ سے بڑی خطرناک ہو جاتی ہیں اور کہیں کہیں تو ایسا ہو جاتا ہے کہ جب لوگ بیچ ندی میں ہوتے ہیں تو یکدم کسی موڑ سے اتنی اونچی پانی کی دیوار چلی آتی ہے کہ موٹر اور ریل گاڑی تک اس میں بہہ گئی ہیں اور کتنی ہی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ جب طوفان اور ندیوں کے خطرات کی باباجان کو اطلاع دی گئی تو آپ نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئے۔ پھر بڑے جوش میں فرمایا کہ میرا دل رجوع ہے، طوفان وغیرہ کچھ نہیں۔ وجے نگرم سے آٹھ میل کے فاصلہ پر نہایت خوشگوار موسم ہو گا اور ہمارے ارادہ کو شاندار

کامیابی ہوگی۔

چنانچہ دوسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے چودہ آدمی معہ موتی کے دونوں جیپ کاروں میں سوار ہو کر چل دیئے۔ اس وقت بڑا خوشگوار موسم تھا۔ گھرے گھرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پہاڑیوں اور جنگل کا نظارہ دلفریب تھا۔ نہایت اطمینان اور لطف سے اسّی میل کا سفر طے ہوا اور نارائن پٹنم پہنچ گئے۔

نارائن پٹنم ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو پہاڑیوں اور ان کے دشوار گزار راستے طے کرنے کے بعد ایک وسیع وادی میں واقع ہے۔ یہاں چاروں طرف پہاڑیوں پر لوگ کاشت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کھیت اور یہ وادی بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ نارائن پٹنم میں ہم لوگ صرف گھنٹہ بھر ٹھہرے کچھ آم جو ساتھ تھے کھائے گئے اور چائے پی کر پھر واپسی کے لئے موٹر پر سوار ہوتے۔ راستہ میں پہاڑیوں پر جہاں جہاں نہایت ہی دلفریب منظر تھے وہاں اتر کر تھوڑی دیر سیر کی۔ اسی تفریح اور چہل قدمی کے وقت ارشاد ہوا۔ ہمارے اس سفر کا مقصد کیا ہے آخر اسے پورا کرنا کیوں ضروری ہے۔ عجب شان ہے۔ کس قدر

لطف کے ساتھ یہ پورا ہوا۔ اُدھر وہ قیامت خیز گرمی اور ناکامی، اِدھر یہ لُطف اور کامرانی۔ مالک کی عجب شان ہے۔ وہ دیکھو تین طوطے اُڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ دیکھو سامنے پہاڑیوں کا سلسلہ۔ یہ سب سے آگے جو لمبا پہاڑ ہے یہ سب سے نیچا ہے۔ اس کے پیچھے پھر دوسرا پھر تیسرا اور چوتھا ایک دوسرے سے بہت اونچے ہیں۔ اور کافی فاصلہ پر ہیں مگر یہاں دیکھیئے سب ایک دکھائی دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیغمبر تھے اس لئے ہاتھ پیر باندھ کر ان کو آگ میں جھونکا گیا۔ اللہ جل شانہ، کے حکم سے آگ گلزار بن گئی۔

یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ

(اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا ابراہیم پر)

اللہ کا عشق (نار) جب کامل ہو جاتا ہے تو مولیٰ کے حکم سے وہ ایک گل بن جاتا ہے۔ اس کی خوشبو فیض رسانی کرتی ہے۔ اس کا رنگ اور اس کی مستی جنت نگاہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی جگہ پہ قایم ہوتا ہے اور اس کی خوشبو سے مخلوق کھنچ کھنچ کر چلی آتی ہے۔ حوریں رس چوستی ہیں۔ خوبصورت تتلیاں نثار ہوتی ہیں اور کوئی کوئی بلبل بھی دیوانہ وار اپنے گیت سُنا سنا کر اپنی جان ہلاک کر دیتی ہے۔ واقعۂ ابراہیم ایک تاریخی واقعہ ضرور ہے

لیکن قرآن کریم کی ہر آیت کی طرح یہ بھی ایک اشارہ ہے۔ وہ پیغمبر تھے۔ ہاتھ پیر باندھ کر آگ میں پھینک دیئے گئے اور آزمائش سے نہ بچے۔ حضرت جبرئیلؑ نے حاضر ہو کر عرض کیا اجازت ہو تو آپ کو اپنے پروں پر بٹھا کر آگ سے بچا لوں۔ مگر حضرت ابراہیم اللہ اور اپنے درمیان کسی سہارے کو کب گوارا کر سکتے تھے خواہ وہ سہارا اللہ کا بھیجا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تو خیر پیغمبر تھے مگر اور لوگوں کو آگ میں کودنے یا نہ کودنے کا قیامت خیز فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ اور کوئی ضروری نہیں کہ دل کڑا کر کے ایک دفعہ کود بھی جائیں تو آگ گلزار ہی بن جائے زیادہ امکان اسی بات کا ہوتا ہے کہ جل کر خاک ہو جائیں گے مگر جب مولیٰ کا حکم ہوتا ہے تو انسان فیصلہ کرے یا نہ کرے یا اِدھر یا اُدھر کود ہی جاتا ہے۔ پھر وہ قلب جو ایک آتش فشاں کی طرح گرجتا تھا اور آگ اگلتا تھا۔ وہی ایک گُل بن جاتا ہے۔ اور دنیا کے لئے ایک احسان بن جاتا ہے۔ دنیا کا ایک سال بارگاہِ قدس کا ایک دن ہے۔ ان دو سفروں کے درمیان ۲۳ دن گزرے تھے تو اشارہ سے ۲۳ سال بعد امن و آشتی کا سفر کرنا مقصود تھا۔

جبرئیل علیہ السلام نے رسول کریم ؐ سے معانقہ کر کے آپ پر سارے علم روشن کر دئے تھے۔ ایسے ہی علم لدنی کی چابی کسی اللہ والے سے ہی مل سکتی ہے۔ قرآن کریم اگر پڑھنا ہے تو کسی فقیر کے زیرِ سایہ کچھ دن گزارنے چاہئیں۔ کیونکہ ان کی زندگی کا ہر پہلو کسی نہ کسی آیتہ کریمہ کی تفسیر ہوتا ہے۔ جامۂ عرفان خرقۂ اویس اس کی منزلت اور معنی تو کوئی گدڑی پوش ہی جانتا ہے۔ دل عجب چیز ہے اور ٹوٹا ہوا دل اس سے بھی عجیب تر۔ ذات کی خوشبو عشق ہے۔ صفات ایک جامہ ہے۔ نار جلال ہے۔ گل جمال ہے۔ ذات ان دونوں سے ماوراء ہے" غرض بابا صاحب یہ اسرار کھولتے جاتے تھے اور اپنے دائیں ہاتھ میں ایک گلاب لئے ہوئے اسی پھول کی طرح مسکراتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ اللہ اکبر!

جلالِ کبریائی در جمالِ مصطفیٰ دیدم

(اللہ کا جلال مصطفےٰ کے جمال میں دیکھا)

لبِ خار پر ہے گلوں کی کہانی
بہارِ غمِ عشق ہے جاودانی
صلہ ہے یہی جستجو آرزو کا
یہاں رب ارنی وہاں لن ترانی
سرِ دوش زلفوں کی کالی گھٹائیں
رُخِ یار جامِ مے ارغوانی
اُجالا اُجالا ہے ان کا تصوّر
انہیں کا ہے پر تو، مری زندگانی
سرِ طور موسیٰ کو بے ہوش کر کے
چلے آئے کہتے ہوئے من رائی
تصویر میں پیری کی چلمن جو اٹھی
نظر آئی معصومیت کی جوانی
یہی حسن اور عشق کی ہے حقیقت
سمندر میں موجوں کی جیسے روانی
مری ابتدا ہی مری انتہا ہے
مطالب سے اب بن گیا ہوں معانی
(رحمان بابا)

باب ۱۴ کرامات

حق کو منوانا بڑا دشوار ہے۔ مسیح علیہ السلام نے مُردے تک زندہ کیئے مگر آخر صلیب پر لٹکا دیے گئے۔ ہر پیغمبر کو حق نے ایک نہ ایک معجزہ عطا فرمایا تھا۔ تاکہ اگر روزمرّہ کے اصولِ فطرت سے ہٹی ہوئی چیز ان بندگانِ خدا کے ذریعہ ظہور میں آئے تو کم از کم اس کے مشاہدہ سے ہی لوگ حق کی طرف رجوع ہوں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی حیاتِ مطہّرہ میں ان معجزوں سے بہت کنارہ فرماتے تھے۔ کیونکہ انہیں دینِ فطرت کو نشر کرنا تھا۔ اور خود فطرت ہی کے معجزہ کی طرف بار بار توجہ دلاتے تھے۔ سورۂ "الرحمٰن" کو دیکھیئے خالق خود کس رمز سے اس نظم و نسق کی طرف توجّہ دلاتا ہے۔ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ میری اُمّت میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو بنی اسرائیل کے نبیوں پر سبقت لے جائیں گے۔ یہی ودیعت بندگانِ خاص میں کرامت کہلاتی ہے۔ کرامت کیا چیز ہے۔ خدا کی ذات حیّ القیوم اور لفظ کن فیکون ایک تاریخی واقعہ ہی نہیں

بلکہ ایک زندہ سلسلہ ہے جو جاری ہے۔ جب مشیت بندہ کی زبان بن جاتی ہے تو اس کی زبان سے جو نکلتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ سامان کی ضرورت ہوتی ہے نہ اسباب کی۔ مگر سالکِ کامل ظاہری عالمِ اسباب کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور صرف اس وقت جب حق جوش زن ہو تو حق کا نام بلند کرنے کے لئے کوئی کرامت دکھاتے ہیں۔ فیض اور چیز ہے۔ یہ ایک پھل کی خوشبو ہے۔ جس سے ہر ایک مستفید ہوتا ہے۔ ذیل میں چند کرامتوں کا ذکر ہے۔ جو حضور بابا جان سے اسی جوشِ حق کے عالم میں ظہور پذیر ہوئیں۔

بارش:۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب حضور بابا جان ناگپور سے بابا تاج الدینؒ سے حکم لے کر وجے نگرم کی بھیانک چٹانوں میں قیام فرما تھے۔ اس زمانہ میں آپ سرخ جوگیے لباس میں ملبوس رہتے تھے اور سوکھے کانٹے کی طرح ہڈی اور پوست ہو چکے تھے۔ جذب وجلال کا یہ عالم تھا کہ ان کے بچپن کے ساتھی بھی پیچھے ہی پیچھے رہتے تھے۔ سامنے آنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ کئی سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ سارے تالاب اور کنوئیں خشک ہو گئے تھے۔ مردہ مویشیوں کی ہڈیوں کے

ڈھیر کے ڈھیر ہر طرف پڑے نظر آتے تھے۔ گرمی اور دھوپ کا یہ عالم تھا کہ پتّوں کا کیا ذکر درختوں کے تنے تک سوکھ چکے تھے۔ ماؤں کا دودھ سوکھ گیا تھا اور ننھّے بچے بلک بلک کر نیم غفلت میں پڑے رہتے تھے۔ میدانوں میں نمازیں پڑھی گئیں۔ مندروں میں گھی کے اگن جلائے گئے اور کیا کیا نہیں کیا گیا مگر اللہ الصمد اس بے نیاز کو کون مناتے اور کس کی آواز اس تک پہنچے۔

شہر کے لوگ جمع ہوئے۔ ان لوگوں نے سُن لیا تھا کہ بستی کا ایک لڑکا ناگپور سے فقیر بن کر آیا ہے اور کالے تالاب کے قریب کی چٹانوں میں پڑا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے سُن رکھا تھا کہ عشق ایک ایسی چیز ہے جو کبریا کے جلال کو بھی تسخیر کر لیتا ہے۔ شہر کے سارے لوگ عالم اور مولوی، بوڑھے اور جوان اور بچے سب حضور بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے خدا کے پیارے ہمارے گناہوں کو معاف کراؤ۔ رحم و کرم کے لئے سفارش کرو۔ خدا کے غضب کی تاب ہم میں نہیں ہے۔ بارش کے لئے دعا کیجئے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ کل دن کے بارہ بجے سب لوگ آؤ میں نماز استسقا پڑھاؤں گا۔ اگلے روز سب لوگ جمع ہوئے۔ وہی سرخ لباس تھا اور سر برہنہ تھا۔ نماز

پڑھائی اور دعا کی۔ لوگوں کے واپس جانے سے پہلے کہا کہ اگر بہت زیادہ بارش ہو تو شکایت نہ کرنا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ اصولاً بھی بارش ہونے میں ایک مہینہ کی دیر تھی نمازی سب گھر لوٹ گئے۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ دوسرے دن بارہ بجے تک سورج کی وہ تپش تھی کہ لوگ الاماں والحفیظ چلاتے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کیا سورج سوا نیزہ پر اتر آیا ہے۔ کیا اسی کو قیامت کہتے ہیں۔ مگر دن کیا ڈھلنا شروع ہوا کہ فضا یکلخت بدلنے لگی۔ کالے کالے بادلوں اور بجلی نے آگھیرا۔ دیکھتے دیکھتے موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ جیسے آسمان کی کھڑکیاں کھل گئی ہوں۔ آٹھ دن تک یہی سلسلہ رہا۔ تالاب جل تھل ہو گئے۔ کنوئیں لبریز۔ ندی نالے سب بھرپور۔ تالابوں کے بند ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ کچے مکان بیٹھنے لگے۔ کچھ لوگ پھر بابا جان کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ بابا جان ہماری پیاس بجھ گئی۔ اب ان آسمانوں کو تھامیئے۔ بابا جان نے کیف و مستی میں مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے۔ تھوڑی دیر بعد اپنی جھونپڑی میں چلے آئے۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں کو لوٹ گئے۔

بارش آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ اور اگلے دن صبح مطلع بالکل صاف تھا۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ خاموش نظر آتا تھا۔ زمین جو سوکھ کر جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اس میں آج ایک مادرانہ خوشبو اور جذبۂ خدمت نظر آتا تھا سوکھی ڈالیاں اب بھی سوکھی تھیں لیکن خدا جانے چڑیاں اور پرندے ان پر کہاں سے آکر بیٹھ گئے اور پیار کے گیت گانے لگے۔ بچے خوش خوش کاغذ کی ناؤ بنا کر بہتے پانی میں کھیلنے لگے۔ وہی سورج جو کل تک مجسم غیظ و غضب تھا۔ آج ایک شفیق باپ کی طرح اپنی شفاف کرنوں سے فضا کو نکھار رہا تھا۔ مگر دنیا۔ اے دنیا تو بھی عجیب ہے۔ چار دن نہیں گزرنے پاتے جب مصیبت دُور ہو جاتی ہے تو تو اپنے محسن کو بالکل بھول جاتی ہے۔ وہی لوگ جو چند دن پیشتر الامان الحفیظ چلاّ رہے تھے، آج آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں کہ بارش تو ہونی ہی تھی۔ اس فقیر نے کیا کیا۔ جب گرمی حد کو پہنچ جایا کرتی ہے تو بارش لازمی ہوا کرتی ہے۔ اس میں کرامت کون سی ہے۔ اللہ رحم کرے۔ انسان کتنا جاہل اور ظالم ہے۔

بارش کی چھتری:۔ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ قبلہ بابا صاحب کو ان پہاڑیوں میں آکر بیٹھے ہوئے ابھی دس سال کا عرصہ

گزرا تھا۔ فقیروں کا کسی جگہ بیٹھ جانا یا قیام کرنا ایک خاص معنی اور اہمیت رکھتا ہے۔ اکثر فقرا کو بذریعہ بشارت یا زبانی بوقت ملاقات حکم ملتا ہے کہ تم فلاں مقام پر جا کر بیٹھو۔ یہ جگہ عموماً دینی اور دنیاوی اعتبار سے اس قدر ناموزوں اور صبر آزما ہوتی ہے کہ صرف ایمان ہی کی طاقت اس فقیر کو وہاں قائم رکھ سکتی ہے۔ یہ ہی حال میٹے کا تھا (جو اس وقت بابا جان کی موجودہ جائے قیام ہے) سرِ شام سے ہی لوگ اس طرف آنا جانا بند کر دیتے تھے۔ علاوہ درندوں اور سانپ بچھوؤں کے یہ جگہ ایسی ہولناک تھی کہ پتھر جیسے دل والے ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔ جنوں اور بلاؤں کی جو وارداتیں اس جگہ آئے دن سُننے میں آتی تھیں۔ ان کی تفصیل خود ایک دفتر ہے۔

قبلہ بابا صاحب کو بذریعہ بشارت اس جگہ پر بیٹھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ان ہی چٹانوں میں جا کر بیٹھ گئے تھے اور ہمیشہ غرق اور مشغول رہتے تھے۔ شہر کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ کوئی فقیر ان ہولناک چٹانوں میں بیٹھا ہوا ہے تو وہ یہ سوچ کر یہ کام کوئی زبردست شخص ہی کر سکتا ہے۔ دو دو چار چار کر کے دنیاوی اغراض کے حصول کے لئے بابا صاحب کے پاس آنے لگے۔ شروع شروع میں آس پاس کی بستیوں کے سادہ مزاج لوگ آتے

اور اپنی امیدوں کا پھل پا کر لوٹ جاتے۔ آہستہ آہستہ شہرت بڑھتی گئی۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک باغ میں جٹا جوگی نامی ایک سادھو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حضرت سے مقابلہ کیا۔ لیکن اسے شرمندہ اور ذلیل ہو کر اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ یہ بات برہمنوں کو بہت ناگوار گذری۔ مگر انہوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیا اور مردِ کامل کی جتنی نشانیاں ان کی پرانی کتابوں میں لکھی تھیں بابا صاحب قبلہ میں تلاش کرنی شروع کر دیں۔ وہ لوگ آخری نشانی جو صرف اوتار کی ہوتی ہے یعنی پیروں میں سنکھ اور چکّر کا ہونا دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ اس کے بعد ہر قسم کے دیدابنت، مالدار، غریب غرض ہر قسم اور ہر مذہب و ملّت کے لوگ دور دور سے آنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ صبح اور شام کے وقت ہزار ہزار لوگوں کا مجمع بابا صاحب کے درشن کے لئے آیا کرتا تھا۔ بابا صاحب کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ جھونپڑی سے باہر بھی صرف چند منٹ کے لئے آتے تھے اور زیارت سے فیضیاب کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

ہوتا چلا آیا ہے کہ برہمن قوم اس ڈر کے مارے کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے سر تو جھکا ہی دیتی ہے اور ہاتھ باندھے

بھی کھڑی رہتی ہے تاکہ کچھ دنیا کے ٹکڑے انہیں بھی مِل جائیں مگر یہ قوم ہے جو بدھ اور کبیر کو بھی گھول کر پی گئی۔ ان کی ذہانت کو ایک نئی ترکیب سُوجھی کہ بابا صاحب کو آزمائش میں ڈالیں۔ اور انہیں شرمندہ کریں۔

اندھرا کے ساحل پر بارش کے موسم میں ایک ہفتہ ایسا ہوتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ جوتشی لوگ اس ہفتہ کا صحیح اندازہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کا بھادوں کا زمانہ تھا اور اگلے دن وہ ہفتہ شروع ہونے والا تھا کہ برہمنوں کی ایک بڑی ٹولی نے آکر بابا صاحب سے عرض کی کہ ہم لوگ سب مل کر آپ کی شان میں ایک بہت بڑی نیاز کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو ہم اسے پورا کریں۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ کب کرنا چاہتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ سامان جمع کرنے میں تین دن لگ جائیں گے چوتھے دن کی اجازت دیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بابا صاحب کو دنیا کی چیزوں میں ایک چیز بہت پسند ہے اور وہ غریبوں کو کھانا کھلانا۔ بھلا وہ اس درخواست کو کیسے نامنظور یا ملتوی کرتے، اجازت دے دی۔ برہمنوں نے جتا جتا کر پوچھا کہ کیا آپ کی اجازت پکی ہے۔ بابا صاحب نے انہیں یقین دلایا

کہ ہاں تم پورے طریقہ سے انتظام کر لو۔

وہ لوگ اٹھارہ من چاول، ترکاریوں کی گاڑیاں، پکانے کی دیگیں، جلانے کی لکڑی اور دیگر سامان لے کر مقررہ وقت پر میٹے یعنی بابا صاحب کی جگہ پہنچ گئے۔ میٹے میں اس زمانہ میں کوئی مکان اور جھونپڑی تو کجا ایک بڑ کے درخت کے علاوہ کوئی سایہ تک نہ تھا۔ انہیں چٹانوں کے درمیان چولھے بنائے گئے اور دیگیں چڑھادی گئیں۔ شہر میں منادی کر دی گئی تھی، کثیر خلقت نیاز میں شرکت کے لئے موجود تھی اُدھر دیگیں چولھے پر رکھی ہیں ادھر آسمان کے دروازے کھُل گئے۔ کالے کالے بادل جوتشیوں کے حساب سے بالکل صحیح وقت گھِر کر آئے اور موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برہمن دل میں بہت خوش تھے مگر چھوٹا سا منہ بنائے بابا صاحب کے پاس پہنچے کہ حضور کیا ہوگا۔ بابا صاحب کھڑے ہو گئے۔ سر پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف رُخ کیا تو دیکھا کہ بارش کی ایک دیوار ہے جو ادھر کو بڑھی چلی آرہی ہے۔ شام ہو چلی تھی۔ علاوہ عام لوگوں کے پانچ سو سے زیادہ برہمن اور پنڈت موجود تھے جو بابا صاحب کی رسوائی دیکھنا چاہتے تھے مگر اللہ جل شانہٗ کو اپنے

پیارے کی رسوائی کب منظور تھی۔ بارش کی دیوار تو بڑھتی چلی آئی، مگر لوگوں نے یہ دیکھا کہ حجرہ سے ایک ڈیڑھ فرلانگ تک چاروں طرف بارش نہ تھی اور اس حصار کے باہر آسمان سے ایسا پانی برس رہا جیسے بالٹیاں کوئی جا رہی ہوں۔ لوگ ششدر اور متحیر تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ سلسلہ رہا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بارش رُک گئی۔ برہمن ہاتھوں میں لیمپ لے کر چاروں طرف تفتیش کرنے نکلے۔ دیکھا کہ بیچ میں صرف ایک تختہ، جزیرہ کی مانند خشک ہے اور چاروں طرف اس زور کی بارش ہوئی ہے کہ ندی نالے بہ رہے ہیں۔

دیگوں کے پکنے کا سلسلہ جاری تھا۔ برہمنوں نے دل میں اس کرشمہ کو کچھ مانا کچھ نہ مانا۔ وہ اب بھی یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی تو کھانا ختم ہونے تک بہت کچھ بارش ہونی ہے۔ کھانا تیار ہوا اور ہزاروں لوگ زیر آسمان کھانے کے لئے تیار ہو بیٹھے تو مشرق سے وہی موسلا دھار بارش کی دیوار بڑھتی نظر آئی۔ بابا صاحب مشرق کی طرف رُخ کئے آسمان سے ٹکٹکی لگائے کھڑے تھے۔ پھر وہی باتیں ظہور میں آئیں۔ سامنے۔ دائیں۔ بائیں۔ پیچھے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر یہ زمین کا ٹکڑا ایک جزیرہ کی طرح بارش سے محفوظ تھا۔ لوگوں نے خوب سیر کی کر کھانا کھایا اور حیرت

سے اس تماشہ کو دیکھتے رہے اور جے بابا جی کے نعرے لگاتے رہے اس طرح وہاں کے برہمنوں نے اس کرامت کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ دو دفعہ اس مقام کے ارد گرد بارش نہ ہوئی۔ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اگر ایک دفعہ ایسا ہوتا تو یہ کہہ کر دل بہلا لیتے کہ اتفاق کی بات تھی۔ مگر دو دفعہ بالکل ان ہی حالات میں اس طریقہ کی چھتری سی بن جانا شکّی سے شکّی کو بھی یقین دلانے کے لئے کافی تھا۔ اگر بارش ہر طرف سے رُک جاتی تو بھی کسی شبہ کی گنجائش تھی مگر صرف اس تختۂ زمین پر بارش کا دو مرتبہ نہ ہونا حیرت کا مقام تھا۔ آخر وہ کون سی چھتری تھی جس نے اس تین فرلانگ کے احاطہ کو ڈیرے کی طرح محفوظ رکھا۔ سب برہمن قائل ہو گئے اور سر کے بل قبلہ بابا صاحب کے قدموں پر جا پڑے اور بہت خوشیاں منائیں۔ بابا صاحب نے کہا جاؤ جاؤ جلدی گھروں کو چلے جاؤ۔ بارش آرہی ہے۔ ابھی لوگ اپنے جوتے بھی سنبھالنے نہ پائے تھے کہ پھر مشرق سے اسی زور کے ساتھ بارش آئی اور سارے تختہ کو ایسے دھو ڈالا کہ نیچے گرے ہوئے کھانے اور پتّے جھاڑو سے جھاڑنے کی طرح صاف ہو گئے اور سارا تختہ دُھل کر پاک و صاف نظر آنے لگا۔ سب برہمن اور مخلوق واپسی میں اس بارش سے

بھیگے تو ضرور مگر وہ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ گویا یہ فیضان ان کے قلوب پر ہو رہا ہے۔ برسوں تک اس بارش کا چرچا دور دور تک ہوتا رہا۔

ناریل کا درخت

حجرۂ مبارک سے کوئی آدھے میل کے قریب باغ کے کنارے ایک کنواں ہے۔ اس کنوئیں سے مِلا ہوا ایک ناریل کا درخت تھا۔ بابا صاحب نے جس دن سے میٹھے پر قیام کیا۔ صبح اور شام غسل فرمانے کے لئے اسی کنوئیں پر تشریف لے جاتے تھے اور اس ناریل کے درخت کے کنارے خوب جی بھر کے غسل فرماتے تھے۔ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ ایک صبح کو جس وقت اس باغ کا مالی اور دو تین اور لوگ موجود تھے بابا صاحب نے ناریل کے درخت کی طرف غور سے دیکھا اور مالی سے پوچھا کہ یہ درخت شاخ کیوں نہیں دیتا۔ مالی نے ہنس کر جواب دیا کہ بابا کہیں ناریل کے درخت کی بھی شاخیں ہوتی ہیں۔ بابا صاحب نے کہا کہ کیوں نہیں دیکھو اسی درخت کی شاخ پھوٹے گی۔ مالی اور دوسرے لوگ یہ سُن کر چُپ ہو رہے۔ پندرہ دن کے بعد مالی بابا صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بابا آپ تو کہتے تھے کہ اس درخت کی شاخ پھوٹے

گی اور وہ تو مر رہا ہے۔ بابا صاحب نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ مالی نے بتایا کہ اس درخت کے پتّے سب اوپر سے سمٹ کر سکڑ گئے ہیں جیسے بند گوبھی ہوتی ہے۔ بابا صاحب نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا تم دیکھتے جاؤ۔ دو ماہ بعد مالی پھر آیا اور کہنے لگا کہ اس درخت میں دو شاخیں پھُوٹ رہی ہیں۔

آج بھی وہ درخت موجود ہے۔ نیچے سے کوئی پندرہ فٹ تک ایک تنا ہے۔ اس کے اوپر بالکل ایک جیسی دو شاخیں دو ہاتھوں کی طرح پھیل کر اوپر چلی گئی ہیں۔ اور خوب پھل دیتی ہیں ان پھلوں میں یہ وصف ہے کہ جہاں اور درختوں کے پھل ہرے ہوتے ہیں۔ اس کے پھل غروبِ آفتاب کی شعاعوں کی طرح سنہرے ہوتے ہیں۔ پھل کا چھلکا پتلا ہوتا ہے اور اندر کا پانی اور مغز نہایت شیریں۔ جن زائرین کے نصیب میں یہ پھل ہوں ان کو مل جاتے ہیں۔ سب کو بھلا کیسے ملیں۔ فقیروں کی اصطلاح میں ناریل کے ایک خاص معنی ہوتے ہیں۔ اگر اس تختہ پر آکر لاولد بوڑھے لوگ اولاد اور نسل کی دعا لے کر فیضیاب جاتے ہیں تو تعجب کی بات کیا ہے۔

مقدر کا پلٹنا:۔ ایک راجہ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ جو

بڑے نازوں سے پلا مگر اس کے جنم پتر میں پنڈتوں نے یہ بات لکھ دی تھی کہ جب یہ لڑکا اکیس سال کا ہوگا تو فلاں دن فلاں وقت کالے ناگ کے کاٹنے سے مر جائے گا۔ یہ سانپ کا گنڈہ اٹل ہے اور چاہے اس زمانہ میں لڑکے کو آپ پانی کے بیچ میں محل بنا کر رکھئے یا آگ کی دیواروں کے قلعے میں رکھیے، بچ نہیں سکتا۔ پرانی کتابوں میں اس گنڈے کے متعلق اور اس کے بچنے کی تدبیریں اور ان کی ناکامیوں کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔" اس لڑکے کے والدین بہت پریشان تھے۔ سارے ہندوستان میں اسے لے کر گھومے ہر جوتشی، ہر رمال نے وہی بات کہی۔ ہر سادھو اور منی نے یہی کہا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہے۔ کوئی کیا کرے۔ راجہ نے بہت سے ایگن کرانے کی کوشش کی جس سے یہ بلا دور ہو مگر ہر دفعہ یہ ہوا کہ ایگن کے دوران میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو گئی کہ وہ رسم پوری نہ ہونے پائی۔

جب لڑکا اس سن کے قریب پہنچا تو اس کے والدین لڑکے کو ساتھ لے کر بابا صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ یہ ۲۳ء یا ۲۴ء کا واقعہ ہے۔ بابا صاحب نے سارا ماجرا سنا اور اتنا کہا کہ "ہوگا۔" وہ لوگ مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ جب وہ دن

بالکل قریب آگیا تو یہ سوچا کہ تدبیریں بیکار ہیں کم از کم اتنا کریں کہ اس کو لے جا کر بابا صاحب کے پاس چھوڑ دیں۔ جب مرنا ہی ہے تو مرے گا ضرور مگر اس کی روح کو تو کم از کم شانتی ملے گی۔ رات کو ایک بج کر کچھ منٹ پر وہ اٹل گھڑی مقرر تھی۔ لڑکے کو لے کر یہ لوگ سرِ شام ہی بابا صاحب کے پاس پہنچے۔ یہ جگہ اس وقت بدتر سے بدتر سانپوں کا مسکن تھی۔ والدین کی ہمت پر بھی آفرین ہے کہ یوں آخری دن لڑکے کو بابا صاحب کے حوالہ کیا اور صرف اتنا کہا کہ "اب آپ جانیں۔ ہم تو اس کو چھوڑ کر گھر جا رہے ہیں۔ صبح آکر لاش کو لے جائیں گے"۔ بابا صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ چلے گئے تو سرِ شام بابا صاحب نے ایک خادم کو شہر بھیج کر پانچ لالٹین اور لڑکے کی کچھ کتابیں منگوائیں۔ پھر شام کو تھوڑی دیر تک خادموں سے باتیں کرتے رہے۔ وہ لڑکا بھی وہاں بیٹھا رہا۔ اس پر کیا گزر رہی تھی، یہ تو ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ جب کافی رات ہو چکی تو اس چٹان کے چاروں کونوں پر چار لیمپ رکھ دیئے گئے۔ بابا صاحب خود جھونپڑی میں چلے گئے اور لڑکے سے کہا کہ تمہیں نیند تو کیا آئے گی کوشش کرو کہ یہ پانچواں لیمپ جو درمیان میں رکھا

ہے اس کی روشنی میں کچھ کتابوں سے دل بہلاؤ اور کوئی قصہ کہانی پڑھتے رہو کہ وقت کٹ جائے۔

صبح سویرے اس لڑکے کے ماں باپ اس خیال سے کہ لاش کو اٹھا کر لے جانا ہے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لے کر آ پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ لڑکا چٹان پر ٹہل رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں وہ اسے اپنے لڑکے کا بھوت سمجھ کر ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے اور اس کا نام لے کر آواز دی۔ لڑکے نے جواب دیا تو انہوں نے اس کا حال پوچھا۔ لڑکے نے کہا کہ میں اچھا ہوں۔ والدین اور قریب آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چٹان کے کنارے ایک چھ فٹ لمبا ناگ جس کے سر پر کچھ بال بھی تھے مرا پڑا ہے اور چٹان پر ادھر اُدھر خون لگا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سانپ نے چٹان پر سر مار مار کر اپنی جان دے دی۔ لیکن لڑکے تک نہ پہنچ سکا۔ بابا صاحب بھی اسی وقت باہر آئے اور جیسے کچھ جانتے ہی نہیں بڑے تعجب سے اس سانپ کو دیکھتے رہے۔ اور ان لوگوں سے صرف اتنا کہا کہ "لے جاؤ اپنے لڑکے کو۔ خوش رہیں گے۔"

یہ ایسے واقعات ہیں کہ عقل حیرت میں رہ جاتی ہے۔ کسی

مغربی تعلیم یافتہ شخص کی سمجھ میں تو یہ بات آ ہی نہیں سکتی۔ ویسے بھی موت کی گھڑی اٹل ہے اس کا علم ہونا یا نہ ہونا یہ دوسری بات ہے اور پھر اگر اس بات کو کوئی مان بھی لے کہ تقدیر اٹل ہے اور قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتا تو پھر یہ واقعہ کیسے ہوا؟ کیا موت کی گھڑی بھی ٹل سکتی ہے؟

اقبال نے کہا ہے۔

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"۔

مندرجہ بالا بیان میں سینکڑوں کرامتوں میں سے صرف چار مختلف نوعیت کی کرامات کا بیان ہے۔ مقصد اس بیان کا یہ ہے کہ بزرگانِ دین کو اپنی طرف تو نہیں مگر اپنے پیغام کی طرف جب خلقت کو رجوع کرنا ہوتا ہے تو ایک یا دو اس قسم کی کرشمہ سازیاں دکھاتے ہیں۔ مگر یہ چودھویں صدی ہے آنکھوں اور کانوں سے محروم۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے کہ لوگوں کی آنکھ ہوتی ہے مگر یہ دیکھ نہیں سکتے۔ کان ہوتے ہیں مگر سُن نہیں سکتے۔ حق کا پیغام بہرحال اس زمانہ میں بھی پہچانا ہے۔ اسی سے آئے دن اس سرزمین پر کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔

دمادم زندگی شانِ قلندر — دمادم سوزِ ایمانِ قلندر

ہمہ دم کیف عرفان قلندر — ہمہ دم شوق فرقانِ قلندر

قلندر بابا قادر شاہ قلندر — پناہے اُمّتے مثلِ پیمبر

نگاہِ بر جہاں تیرہ بختے — نگاہِ پاک برہانِ قلندر

یہ آں سوزے کہ سوزِ کن فکان است — بسوز ایں عالم تاریک اختر

دگر گوں کن زمانِ ماؤ تورا — بہ ضرب لاالٰہ ضربِ قلندر

قلندر ہست شان حیؔ قیوّمؔ — ھو اللّٰہ احد اللّٰہ اکبر

ولیؔ از بابا قادر شاہ قلندر
جہانے یافتہ دیگر قلندر

(ولی الدین)

خمخانۂ وحدت میں ہشیار نہیں آتا
اس عالمِ حیرت میں جز یار نہیں آتا

دنیائے محبت میں کیا کام من و تو کا
منصور جو آئے بھی بے دار نہیں آتا

کہتی ہے یہ گلشن میں غنچوں کی جگر تابی
کلیوں کو یہاں کھِلنا بے خار نہیں آتا

دریائے محبت میں انوار کی موجیں ہیں
بے کشتیٔ دل کوئی اس پار نہیں آتا

کیا بات ہے گلشن میں جب ذکر ترا آیا
یہ ذکر بجز چشم خونبار نہیں آتا

دربار میں قادر کے بٹتی ہے متاعِ دل
اللہ کے شیروں کو انکار نہیں آتا

(رحمٰن بابا)

باب ۱۵ ارشادات

قرار۔ کائنات میں کسی چیز کو بھی قرار نہیں۔ ہر شے کا دل بے قرار ہے۔ چاہے وہ انسان ہو یا کچھ اور۔ چرند ہو یا پرند۔ زمین ہو یا آسمان۔ پہاڑ ہو یا دریا۔ ہر ایک قرار چاہتا ہے اور قرار کی طرف دوڑتا ہے کہ شاید اس چیز سے ملے یا اُس چیز سے۔ بھوکا کھانے کی طرف بھاگتا ہے اور پیاسا پانی کی طرف۔ اور عاشق معشوق کی طرف۔ مگر نہ خوُد "کھانے" ہی کو قرار ہے نہ "پانی" کو اور نہ "معشوق" کو قرار صرف حق کو حاصل ہے۔ جس دل میں حق پوری طرح سمایا ہو وہی حی القیوم کا مصداق ہوتا ہے۔ ہر چیز کا فطری طور پر حق کی طرف کھنچ کر آنا لازم ہے۔ قرآن بھی فرماتا ہے

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

تشریح :۔ صبر و توکّل جو فقیر کی فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں حق کے فیضان کا راستہ کھول دیتے ہیں۔ تجسّس و تردد اور کوشش جو عموماً نفس کی تاویلیں ہوتی ہیں فیضان میں رکاوٹ پیدا کرسکتی ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھنے والا ان سے پاک ہوجاتا ہے۔

صراطِ مستقیم کی شاہراہ اس کے سامنے کھلی ہوتی ہے۔ اور وہ روح قلب اور لطیفۂ نفس کو ساتھ لئے ہوئے حق تک پہنچ جاتا ہے۔

۲۔ روشن ضمیری

دل میں خواہ دیا سلائی ہی کیوں نہ رکھی ہو مگر جب تک رگڑی نہیں جاتی آگ پیدا نہیں ہوتی۔ لکڑی سے لکڑی کو اگر خوب رگڑیں تو اس میں بھی آگ پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ہر سلائی سے ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ریاضت کی رگڑ ہے۔ یہ من و تو کی رگڑ ہے۔ میں خارج تو داخل ہے۔ یہ سینچتے جائیں۔ جب پُر ہو جائیں تو اچانک تکمیل ہو جاتی ہے۔ باطن روشن ہو جاتا ہے۔ ماورا سب آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ علم لدنّی اسی کا نام ہے۔ دنیا کی ہوا اس کو بجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر جو آگ اچھی طرح جڑ پکڑ جائے یہ اسے بجائے بجھانے کے اور بھی بھڑکاتی ہے۔

تشریح :۔ خود اگر انسان چاہے کہ غیب کے راز روشن ہوں تو وہ اپنی خواہش اور اپنی کوشش سے کبھی نہیں ہوتے۔ مگر جب خود میں خودی نہ رہے اور قلب میں جلا ہو تو یہ آئینہ ماضی، حال، مستقبل تینوں حالتوں کی ایک جیسی عکاسی کرتا ہے۔ اور اگر انسان سلوک میں ہو تو ان چیزوں کا ہوش بھی رہتا ہے

لطیفۂ نفس سے جب قیام لطیفۂ قلب میں ہو جاتا ہے تو ادہر روح اور عالمِ امر اور اُدہر نفس اور عالمِ اسباب دونوں ہی کی عکاسی کرتا ہے۔ عالمِ مثال کی دنیا میں قلب لبس رہتا ہے۔

۳۔ مِلّت :۔ دوپہر کے کھانے پر کسی میٹھے کھانے پر ایک دفعہ خشخاش چھڑکی ہوئی تھی تو فرمانے لگے۔ دیکھو یہ خشخاش کتنی چھوٹی چیز ہے۔ یہ افیون کے پودے کا بیج ہے۔ افیون کے کھیت بلاسپور کی طرف ہوتے ہیں۔ کھیتوں کے اطراف لوہے کا جال ہوتا ہے اور مسلح پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ اندر صرف وہ لوگ کام کرسکتے ہیں جو خود افیون کھاتے ہوں۔ ان لوگوں کو کام کرنے میں بجید خوشی اور سرور محسوس ہوتا ہے۔ یہ لوگ عام طور سے مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ لوہے کے ناخنوں سے پھل کو کھرچتے ہیں اور اس کا سوکھا ہوا دودھ جمع کرلیتے ہیں"۔ پھر آپ نے فرمایا ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے جب میں اننت گری گیا تھا۔ وہاں کافی کا کنٹریکٹر ایک اینگلو انڈین کالے شاہ نامی تھا۔ اس نے لے جاکر سارے باغات اور فیکٹری دکھائی تھی۔ کافی کا درخت سلور اوکس کے سایہ میں ہوتا ہے۔ اس کا پتا بھی سفید اور پھل بھی سفید ہوتا ہے۔ کافی کے پھل بالکل سُرخ ہوتے ہیں اور گچھے لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔

اِن پھلوں کو پہاڑی لوگ توڑ کر ڈھیر کے ڈھیر جما لیتے ہیں۔ تھوڑی سی دھوپ کھا کر یہ پھل جب کمہلا جاتے ہیں تو پکا کر ایک بڑی مشین کے پیپے میں جھونک دیئے جاتے ہیں اور مشین ہاتھ سے چلائی جاتی ہے۔ کسی بیل یا جانور سے نہیں۔ مشین بڑے زور سے کٹ کٹ آواز کرتی ہے جو بڑی دور تک سنائی دیتی ہے۔ مشین میں سے ایک طرف سے بیج اور دوسری طرف سے چھلکے خارج ہوتے ہیں۔ چھلکے نہایت سخت ہوتے ہیں۔ ہڈی سے بھی کہیں زائد سخت۔ بیج ہرے رنگ کے ہوتے ہیں اور بالکل تیار۔ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ٹاٹ کے تھیلے میں بھر کر وجے نگرم ایجنٹ کے پاس بیل گاڑی میں روانہ کر دیتے ہیں جہاں پر یہ جانچے اور تولے جاتے ہیں۔ جب ضرورت ہو تو ان بیجوں کو ذرا بھون کر پیس کر کافی تیار کر لی جاتی ہے۔"

بابا صاحب نے کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔" اسی فارم کے کنارے آٹھ صندل کے درخت تھے ان میں سے کسی کو نہیں کاٹا گیا تھا اندرِ جنگل میں صندل کے دس ہزار سے بھی زیادہ درخت ہیں۔ یہ سب حکومت کے ہیں۔ کالے شاہ نے ایک پہاڑی آدمی کو کسی درخت کا پتہ دے کر بھیجا تھا کہ اس کو کاٹ کر جڑوں سمیت لے آؤ۔ کیونکہ ان لوگوں کو شناخت ہوتی ہے کہ کون سے درخت خوشبودار

ہوتے ہیں۔ اس درخت کا تنا ایک ہاتھ سے دو تین انگل کم تھا اور اس میں تین موٹی موٹی جڑیں تھیں۔ باقی باریک جڑوں کو چھانٹ کر صاف کر دیا گیا تھا۔ صرف ان تین جڑوں کو علیحدہ کر کے کچھ جنگل کی گھاس کے ذریعہ تنے سے باندھ دیا گیا اور ہمارے ساتھ موٹر پر رکھوا دیا گیا تھا۔ کچے صندل میں بھی بیحد خوشبو تھی"۔ بابا صاحب جس وقت یہ فرما رہے تھے اسی وقت آپ نے چندو ملازم کو بلا کر حجرۂ مبارک سے تسبیح منگوائی اور کہا کہ اس کچے صندل میں اتنی خوشبو نہیں ہے جتنی کہ اس حجرہ والی تسبیح میں ہے۔ پھر تسبیح کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تھوڑی دیر غور سے دیکھ کر خوب رگڑا اور اپنی سیدھی ہتھیلی کو سنگھا کر پوچھا "کیسی خوشبو ہے؟" اس میں کچھ عود کی سی خوشبو تھی۔ پھر تسبیح کو سنگھایا۔ اس میں بھی خوشبو موجود تھی۔ اس کے بعد فرمانے لگے میرے پاس آٹھ دس تسبیحیں تھیں مگر برہمن لوگ ایک ایک کر کے لے گئے۔

تشریح :۔ ارشاداتِ بالا کی کیا تشریح کی جائے۔ ایک ایک لفظ معنی سے پُر ہے۔ صرف اشارۃً کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ عشق کے سرور اور کیف کو شراب سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اس میں زیروبم ہوتا ہے اور جوش ہوتا ہے۔ یہی کیفیت جب مقام روح

تک پہنچ جائے تو اس میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ ہوش و بیہوشی، جوش و مستی دونوں سے کہیں ماورا ہو جاتا ہے۔ ہوش میں ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ ایک بہت گہرا نشہ ہوتا ہے۔ یہ تو رہا شراب کا اثر۔ مگر یہ کالی افیون جس کے خون میں پیوست ہو اس پر نہ سانپ کا زہر اثر کرتا ہے نہ کوئی امرت ہی کام کر سکتا ہے۔ یہ بڑی ممسک بھی ہوتی ہے اور انقباض سے بھی ماورا۔ یہ روحانی قوتوں کو منتشر نہیں ہونے دیتی اور ھُوْ ھُوْ، اللہ ھُو کے ساتھ ایک مستقل رشتہ باندھ دیتی ہے جس کو نہ کوئی طاقت توڑ سکتی ہے، نہ بڑھا سکتی ہے، نہ گھٹا سکتی ہے۔

کافی :۔ سرخ سرخ گچھے، اجتماعِ اُمت، جسم کی مشین میں ذکر کی کُٹ کُٹ کُٹ۔ بوریوں میں ڈال کر صاحبِ خدمت کے پاس جا پڑتال اور پھر تھوڑی سی ریاضت کی سینک اور پسائی کے بعد یہ افرادِ خدمتِ خلق کے قابل بنا دیئے جاتے ہیں۔

صندل :۔ جیسے شیر اور ہاتھی دونوں حیوانات کے بادشاہ ہوتے ہیں ویسے ہی صندل کا درخت جنگل میں نباتات کا بادشاہ ہے۔ نازک بھی ہوتا ہے اور حیدری قوت بھی رکھتا ہے

اس کی خوشبو اور مستی اس کی دلآویزی اور پائیداری جو زمین سے علیحدہ ہو کر بھی اپنی خوشبو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رکھتا ہے۔ یہ انعام تو کچھ کلمہ گو فقراء ہی کا حصّہ ہے۔ اور وہ آٹھ صندل کے درخت نمعلوم کس کی طرف اشارہ تھا۔ اسی طرح صندل کی تسبیح۔ عرس کے موقع پر صندل کا نکالنا۔ جھنڈے پر صندل کے ہاتھ کا نشان۔ واللہ اعلم ان اشارات کے کیا معنی ہیں۔

۴۔ حق کی تلاش :۔

بابا جان اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ "تم کو حق کی کیا تلاش ہو گی۔ حق کو تمہاری تلاش ہے"۔

تشریح :۔ یہ بات کچھ حسن کی ذات میں داخل ہے کہ خلق مجھے دیکھے اور پہچانے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ کس طرح دربار عام میں فیض کا بازار گھلا رہتا ہے۔ اور خلقت ہزاروں کی تعداد میں آتی ہے اور جاتی ہے۔ یہ سب کچھ خلق کی صرف خدمت ہی نہیں ہے بلکہ اس ذریعہ سے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں۔ لوگوں کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ سچ مچ چاہتے کیا ہیں۔ کبھی ادھر دوڑتے ہیں اور کبھی اُدھر دوڑتے ہیں۔ اور ان ہزاروں میں سے جس کسی میں صلاحیت دیکھی اُسے چُن لیا جاتا ہے کہ آگ

لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ آئے دن یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ لاعلاج بیماریوں کی شفا کے لئے یا مالی مشکلات کے حل کے لئے یا اولاد کے لئے۔ چاہے وہ باتیں پوری ہوں یا نہ ہوں وہ خود کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ یہ جو خدمت کا بازار گرم ہے جہاں دنیوی اعتبار سے ہزاروں لاکھوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اس کا اصل مقصد تو خالصتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق کا بول بالا ہو۔ تب ہی تو آپ فرماتے ہیں "تمہیں حق کی کیا تلاش ہو گی خود حق کو تمہاری تلاش ہے۔"

ایک دفعہ دربار میں حسب معمول کاموں سے فراغت پاکر رات کے تقریباً بارہ بجے چند خادم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ موضوع یہ تھا کہ رسمی پیر تو بہت سے ہیں جو مریدوں سے سخت محنتیں کرواتے ہیں اور ملتا کچھ نہیں اور سچے پیر آج کل کی دنیا میں کسی خوش نصیب ہی کو ملتے ہیں اور بہت کمیاب ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو حضرت قبلہ کی قیام گاہ سے کافی فاصلہ پر ہوئی تھی۔

صبح ناشتہ پر بابا صاحب قبلہ نے دوہہ نہایت ہی پیارے انداز سے پڑھا۔ سے

پیاس نہ جانے دھوبی گھاٹ
بھوک نہ جانے جھوٹا بھات
نیند نہ جانے ٹوٹا کھاٹ
پریت نہ جانے جات و پات

پھر جوش میں آکر فرمانے لگے کہ اگر طلب ہو تو دینے والا جھک مار کر دیتا ہے۔

ایک دن زمانہ حال کی روش پر ارشاد ہوتا ہے۔

سچّی پریت کنول بھیئو
جل سُو کھے جل جائے
جھوٹی پریت بگلا بھیئو
جل سُو کھے اُڑ جائے

کس قدر سچ کہا ہے۔ آج کل کے زمانہ میں چہ دنیا چہ دین ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر بگلہ کی طرح مشغولِ حق ہوتے ہیں اور جہاں سادہ لوح مچھلی پاس سے گزری اسے ہڑپ کر گئے نفس کی طلب میں لینا ہی لینا ہوتا ہے، چہ دنیا چہ دین۔ اور دل کی طلب میں دینا ہی دینا ہوتا ہے، چہ دنیا چہ دین۔

ارشاد:— آج کل کی دنیا میں سب ندی نالے، اور

پہاڑی چشمے سُوکھ گئے ہیں۔ عرب کی زمین بھی عجب زمین ہے وہاں صحرا ہی صحرا چٹیل ریگستان اور کہیں کہیں نخلستان ہوتا ہے جس میں پانی کے چشمے اور اس کے ارد گرد کھجُور کے درخت ہوتے ہیں۔ یہ چشمے بیس گز چالیس گز لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور ان میں اتنا پانی ہوتا ہے کہ ہزاروں اونٹ بھی ایک وقت میں سیر ہو کر پیئیں تو بھی اس میں کمی نہیں آتی۔ ان چشموں میں پانی زمین دوز نہروں کے ذریعہ پہنچتا ہے جنہیں ظاہر کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں بظاہر چشمہ نظر بھی نہ آئے اونٹ سونگھ کر بتا دیتے ہیں اور ایک بالشت یا ایک ہاتھ کھودنے سے پانی نکل آتا ہے۔ اونٹ بھی عجب جانور ہے۔ اسے ship of desert یعنی صحرا کا جہاز کہتے ہیں۔ یہ بہت بوجھ لادتا ہے۔ بظاہر اپنی استعداد سے کہیں زیادہ بھوک اور پیاس کی بے انتہا برداشت ہوتی ہے۔ جہاں مِلا جتنا مِلا کھا پی لیا۔ نہیں مِلا تو ہفتوں پرواہ نہیں۔ ویسے تو نہایت بے ضرر اور دوستانہ ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی انسان کی کھوپڑی بھی چبا جاتا ہے۔

کھجور کے درخت میں عجب صفات ہیں۔ جو نشانیاں' الف اللہ کی طرح قیام کئے ہوتا ہے نہ اس میں شاخیں ہوتی ہیں'

نہ کوئی خاص سایہ۔ اس کے پھل اتنی اونچائی پر ہوتے ہیں کہ جو چڑھنا جانتے ہوں وہی پہنچ سکتے ہیں۔ کسی سیڑھی سے بھی ان تک پہنچ نہیں ہو سکتی۔ کھجور کے بیج سے بھی اور درخت لگائے جا سکتے ہیں مگر تخمی ہوتے ہیں۔ کھجور کے قلم تو لگائے نہیں جاتے۔ مگر اس میں بھی وہی زمین دوز کمال ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں جو دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بچے اُبھر آتے ہیں اور اس طرح نخلستان آباد ہوتا ہے۔ یہ زمین دوز چشمے، یہ نخلستان، یہ اونٹوں کا بوجھ اٹھانا اور صحرا کے سفر طے کرنا نمعلوم کس باطنی نظام کی طرف اشارہ ہے۔

سبحان اللہ قلندری کی بھی کیا شان ہے

مندرجہ بالا بیان میں صرف دو چار باتیں مقصد کی وضاحت کے لئے لکھ دی گئی ہیں۔ اگر سارے ارشادات کو جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں بھی یہ کام مکمل نہ ہو سکے۔ ایک اور ارشاد فقراء کے لئے ایسا ہے جس کا لکھنا ضروری ہے۔

۵۔ فقراء کے لئے

کبھی اس کا خیال نہ کرنا کہ ہم کہاں پہنچے۔ کس مقام پر ہیں، یا کیا ملا؟ صرف اس بات کو دیکھو کہ میں کس حد تک

فنا ہوا۔ مجھ میں کیا مَیں باقی ہے؟ حق کو پانے کا یہی راز ہے۔
بابا جان اکثر ارشاد فرماتے ہیں۔ میرا دل مٹھی میں ہے۔
بزرگانِ دین کی ہر بات رمز سے پُر ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جس کی بابت غوث الاعظم نے فرمایا تھا کہ ایک حد پر عشق بے حجاب ہو جاتا ہے۔ یہ خود آگہی کی انتہا ہوتی ہے۔ خود آگہی تو خیر آگے کی بات ہے۔ جس نے روح کے مقام کی لذّت دیکھ لی ہو وہ واپس نہیں آتا۔ پھر خود آگہی کے باوجود عبد بننا ایک کامل بندہ ہی کا مقام ہو سکتا ہے۔ ہم لفظ عبد سے سمجھتے ہیں کہ بندہ کا کام حکم ماننا ہے اور حکم کو ہم سمجھتے ہیں کہ ایک خارجی چیز ہے، تابعداری ہے۔ مگر جو محبوب کے اشارہ کو پہچانتا ہے اس سے پوچھیں حکم کی لذّت۔ عبد بننا آسان نہیں۔ عبد وہ ہے جس کے ہاتھ کٹے ہوئے ہوں۔ عبد خود آگاہ ہوتا ہے۔ یہ لفظ خود آگاہی سوائے ذاتِ باری کے اور کسی پر چسپاں ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ کائنات کا وجود اور تخلیق تفسیر ہے خود آگہی کی۔ ارشادِ باری ہے۔ زمین کُل کی کُل میری مٹھی میں ہو گی۔ قیامت کے دن۔ یہ تخلیق اور کن فیکون والی بات ہے۔ کچھ دمادم والی بات ہے۔ اس مقام کا تخیّل بھی فقیر نہیں کر

سکتا۔ نہ اس کی صدا سُن سکتا ہے جب تک کہ اس کی فقیری تلوار کی دھار والی بات نہ ہو۔ یعنی دمادم قلندری۔

دل حریم ہے۔ دل جملہ عشق ہے۔ دل جملہ تخلیق ہے۔ اس کو مٹھی میں سمالینا تخلیق کو مٹھی میں سمالینا ہے۔ یہ مقامِ خود آگہی سے ہی ہو سکتا ہے۔ کُل زمین کا قیامت کے دن مٹھی میں ہونا قیام ہو جانے والی بات ہے۔ دائم، قائم، قادر کی تفسیر ہے۔

اس عشق کی دائم منزل میں اس کیف کی دائم دنیا میں

تو دائم قائم قادر ہے، سبحان اللہ، سبحان اللہ

۱۹۵۴ء میں حضور نے ایک خادم کو لنگوٹ باندھنے کے لئے فرمایا۔ انہوں نے لنگوٹ سلوا لئے اور باندھنے شروع کئے۔ پھر بھی بابا جان وہی فرماتے رہے۔ برسوں بعد بات سمجھ میں آئی کہ لنگوٹ باندھنا دم کو کہتے ہیں۔ چاہے خیالات ہوں یا جنسی تعلق۔ تین منٹ سے زیادہ تسلسل نہیں رہتا۔ مرد اس کو کہتے ہیں جس کا دم نہ ٹوٹے۔ رات ہو یا دن۔ پھر ظاہر یا خفی ذکر کا ہی نہیں بلکہ تحت الشعور میں بھی۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ ہر نفس پچھلے سے تیز تر۔ یہ ہے دمادم مست قلندر۔

الغرض بابا صاحب کے بیان میں خاص بات یہ دیکھی گئی

ہے کہ اگرچہ بات نہایت سیدھی سادی ہوتی ہے مگر دل میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہے اور وہیں بس جاتی ہے۔ نہ دماغ میں کوئی بحث پیدا ہوتی ہے نہ الجھن۔ بس دل مان لیتا ہے اور وہ بات اپنی ہی ہو جاتی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(غالبؔ)

دوہے

تن چرخا من روئی پریم کے تار بناؤں
برہ کھڈی چولا بُن کر پیتم کو پہناؤں

جن نینوں سے پیتم دیکھے وہ نیناں مت کھول
دھیرے دھیرے سپنا بن جا اپنے من میں ڈول

(رحمان بابا)

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

اودم ہی اودم ہے سارا جیون — "میں" "تو" کا چھایا اندھیارا
آنکھ مچولی کھیلے پیارا — کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

نیارے نیارے کھیل رچائے — چنچلتا سے من بہلائے
آپ بگاڑے آپ بنائے — اپنے گھر اپنا مہمان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

سب سنسار میں آپ بھبیّوہ — بہن بھائی، ماں باپ بھبیّوہ
پوجا پاٹ اور جاپ بھبیّوہ — جھوٹا ہے سب تیرا گیان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

پنڈت بن کر پاپ کٹاوے — مُلّا بن قرآن پڑھاوے
کرموں کا پھر جال بچھاوے — فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

بُرے بھلے میں آپ سمایو — دین دھرم کا ڈھونگ رچایو
سیدھی بات کو بھید بنایو — پیالی میں اُٹھا طوفان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کُٹیا میں ہے بھگوان

جیون تیرا ہے پریم کا پتر — انگ انگ ہے اکشر اکشر
جس کو پڑھ لے رام منوہر — اس کا دوجگ میں کلیان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

کیوں رحمٰن ہے تو الجھن میں — پریم کی جوت جگالے من میں
ہری درشن کر گُر درشن میں — ہر گُر دونوں ایک سمان

بندے اپنا آپ نہ جان
تن کٹیا میں ہے بھگوان

(رحمٰن بابا)

تصور میں میرے اگر تم نہ ہوتے
تو یہ زخمِ دل کے چراغاں نہ ہوتے

جو تم رونقِ بزمِ امکان نہ ہوتے
سپہر بریں ماہ و انجم نہ ہوتے

یہ روئے منوّر، یہ کاکل یہ عارض
قدِ نازنیں پر قیامت نہ ہوتے

وہ جلوہ سراپا دکھایا تو ہوتا
تمہاری قسم ہوش ہوتے نہ ہوتے

تمہاری نظر کے اشارے نہ ہوتے
تو ہم اک نظر پر تصدّق نہ ہوتے

ہر اک نقشِ پا میں تمہیں ڈھونڈتے
یہ کون و مکاں حد سے باہر نہ ہوتے

جو ہم رقص میں مرغِ لبسمل نہ ہوتے
تری بزم کی شمعِ محفل نہ ہوتے

ولی عشق میں ہوش کھوئے نہ ہوتے
تو ان کی محبّت کے چرچے نہ ہوتے

(ولی الدین)

آخری دور باب ۱۶

۱۹۵۹ء میں وہ زمانہ آگیا جب بابا جان پھول سے بھی زیادہ نازک بچّہ سے بھی زیادہ سادہ اور معصوم معلوم ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے لطافتوں کا زمانہ کہہ لیں۔ جیسے ہیرے کی جگہ اس کی تابناکی، شمشیر کی جگہ اس کی آب۔ مگر اس لطافت کا اندازہ کون لگائے۔ جب تک خود لطیف نہ ہوں اس لطافت میں اپنی کثافت ہی نظر آتی ہے۔ کل تک جس کو قادر و قیوم کی شان سمجھتے ہیں آج وہی انہیں ایک کمزور و ناتواں بچے جیسی ہستی نظر آنے لگتی ہے۔ اُنکی عقل اور دِل پر پردے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر واہ رے بابا کی شان کہ بلند سے بلند تر مقام پر قیام ہونے کے بعد بھی عبدیت کو ہاتھوں سے نہیں دیا۔ پوری تابناکی سے شانِ خداوندی کی برسوں تک جھلک دکھانے کے بعد بھی اس فانی جسم کی ساری شریعتیں پوری کرتے رہے۔ ناگپور گئے تو وہی فرمانبردار فرزند جو والدین کے آگے ادب سے کاندھے جھکائے رکھتے تھے اور خلوص و محبّت میں سجدۂ نیاز پیش کرتے ہیں۔ بابا

تاج کے لئے بھی کتنا صبر آزمائی کا مقام۔ یہ نقشہ دیکھنا ہوگا کہ وہی کمسن الّھڑ بچہ جس کے لکڑی چیرنے کے مشقّت کے تخیّل سے ان کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اب سراپا انوار ہو کر لوٹا ہے اور اب حُسن کے سانچے میں پوری طرح سمو جانے کے بعد سراپا جمال بنا سامنے کھڑا ہے۔

سفرِ ناگپور:۔

۱۴ اگست ۱۹۵۹ء کو ۱۸ شخصوں کی معیت میں ناگپور کے لئے روانگی ہوئی۔ قادر نگر سے اسٹیشن تک خلقت ساتھ تھی اور اللہ اکبر، جے قادر بابا، جے نارائن کے نعرے لگاتے رہے تھے۔ ڈے پور سے گاڑی ناگپور کے لئے بدلی گئی۔ ڈونگر گڑھ اسٹیشن پر پہلے سے اتنی خلقت بابا صاحب کو دیکھنے کو جمع تھی کہ سارا پلیٹ فارم آؤٹر سگنل تک بھرا ہوا تھا۔ گاڑی دو گھنٹہ لیٹ ہوئی۔ ناگپور پہنچے تو بھی بہت لوگ استقبال کے لئے جمع تھے۔ باباجان لوگوں سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی میں ہی آرام فرماتے رہے۔ اس لئے کہ گاڑی ناگپور جاکر رُک جاتی ہے اور پھر یہی دو گھنٹہ بعد واپس جاتی ہے۔ بظاہر سفر کی تکان کہہ لیں مگر بباطن یہ بچّے کا ماں کی گود میں پہنچنا تھا۔ زندگی کے طویل سفر



آخری دَور

کے بعد گھر کو واپسی تھی۔ باباجان گاڑی ہی میں آرام کرتے رہے اور ادھر اسی گاڑی کے ناگپور سے واپس لوٹنے کا بھی وقت قریب آ پہنچا۔ لوگوں نے دیکھا کہ باباجان کے جسم میں نہ کسی قسم کی حرکت تھی نہ سانس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بے چینی اور فکر میں خادموں نے پاسِ ادب چھوڑا۔ اور خود قریب آنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے بابا کے چہیتے کتّے وزیری کو ڈبّہ کے اندر کر دیا۔ وزیری پیروں میں بھی لپٹا مگر بابا میں نہ کسی قسم کی جنبش ہوئی نہ حرکت۔ خادموں کا شک اب شدّت اختیار کر گیا۔ دل تو نہ کہتا تھا کہ ختم فسانہ ہو گیا لیکن شدّتِ جذبات سے لوگوں نے رونا شروع کر دیا۔ کس کو کس کا ہوش تھا۔ مگر کسی کا دل نہ مانتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اتنے میں باباجان خود اُٹھ بیٹھے اور اتنے تازہ دم اور شگفتہ جیسے لیٹے ہی نہ تھے۔ غسل کے لئے پانی مانگا۔ غسل فرمایا۔ خادموں نے جلد جلد کپڑے پہنائے اور ریل سے اس وقت اتار لیا جبکہ وہ واپس روانہ ہونے لگی تھی۔

بابا تاج الدین اولیا کے مزار پر باباجان پہنچے تو پہلے سجدۂ نیاز پیش کیا اور شعر پڑھا۔

جنت کا در کھلا ہے تیرے در کے سامنے — بیشک خدا کا گھر ہے تیرے گھر کے سامنے

یہ نیاز مندی کچھ اتنی شان اور صداقت سے ہوئی کہ تمام حاضرین کے منہ سے واہ واہ نکل گیا۔ تاج باغ سے شکر دھرا پہنچے تو گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک سادھو نے جو تلک لگائے تھے خیر مقدم کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بابا تاج الدینؒ بیٹھا کرتے تھے۔ خیر مقدم کیا کی نگاہیں نیچی رہیں اور اس جگہ سجدۂ نیاز پھر پیش کیا۔ یہاں سے سادھو صاحب ساتھ ہو کر تعلیم خانہ، کبوتر خانہ، گھوڑے اور شیر کی جگہ دکھلانے لے گئے اور بابا تاج الدینؒ کے رہنے کی جگہ دکھاتے ہوئے رگھوجی راجہ کے محل تک لے گئے۔ محل میں مہارانی نے دودھ کا پیالہ پیش کیا تو بابا جان نے فرمایا اس جگہ پہلے چائے کا پیالہ پیا تھا، اب دودھ کا پیالہ پی رہا ہوں۔ کچھ چکھ کر خادم کو دیدیا۔ پھر فرمایا اسی جگہ بڑے بڑے آئینے میں نے پتھر مار کر توڑے تھے۔ محل سے باہر وہی سادھو لے گئے اور بابا تاج الدینؒ والے کمرہ میں پہنچایا۔ یہاں بابا جان نے پلنگ کو بوسہ دیا۔ پھر اس چبوترہ پر جہاں بابا تاج الدینؒ نے رحلت فرمائی تھی زمین بوس ہوئے۔ وزیری نے بھی گردن سر کے ساتھ ملادی۔ اس جگہ کے مجاور نے چائے پیش کی تو بابا جان نے فرمایا کہ اُس زمانہ میں چائے میں نمک ڈال کر پیتا تھا اب شکر ڈال کر پیتا ہوں۔ دو

ایک گھونٹ پی کر خادم کو دے دی۔ مہارانی نے ایک ریشمی چادر سر پر لپیٹ کر نذر پیش کی اور سادھو بھی کار تک چھوڑ کر چل دیئے۔ یہاں سے سب رخصت ہو کر اسٹیشن گئے اور کچھ دیر آرام کے بعد پھر تاج آباد پہنچ کر مزار مبارک پر دوبارہ قدم بوسی فرمائی اور اس وقت پھر وہی شعر پڑھا۔

تاج آباد سے واپس آکر جبلپور والے نیل کنٹھ بابا کے مزار پر پہنچے۔ ان کے بیوی بچوں نے قدم بوسی کی تو بابا جان نے یاد دلایا کہ ایک وہ وقت تھا جب نیل کنٹھ بابا منہ میں سگریٹ لگائے کبوتر کی طرح لوٹتے تھے اور کہا تھا کہ تمہارے میں کیا کمال ہے۔ کیا کمال ہے، رات کو ناگپور سے کلکتہ روانہ ہوئے۔ کلکتہ پہنچ کر صرف نئی مارکیٹ چار پانچ منٹ صرف باہر سے دیکھی۔ وہاں جما فقیر کا مزار زیرِ زمین تھا جس نے کالی کے جادو کو بنگال سے ختم کیا تھا۔ پھر کالی کے مندر کے سامنے سے گزر کر واپس اسٹیشن آگئے۔ بس یہ تھی کلکتہ کی سیر۔ کالی کے پجاریوں نے مندر کے اندر بلایا تو فرمایا کالی کو تو جما فقیر نے پہلے ہی گاڑ دیا ہے۔ مجھے اس کا کیا کرنا ہے۔

سفرِ آخرت کی تیاری :۔

۵۹ء سے اور مجھے اس سے بھی قبل اب ظاہری نشانیوں

سے بھی آگے کی باتیں دیکھنی شروع کیں۔ یعنی عالم ارواح میں بشارتوں میں اپنے یا دوسرے جنازے دیکھنے شروع کئے۔ کچھ نے بابا جان ہی کا جنازہ دیکھا اور کچھ نے ان کا سبز کپڑے میں ڈھانکا جانا۔ الغرض دور دراز کے رہنے والوں کو بھی عالم رویا میں بہت عرصہ قبل ہی خبریں دی جانے لگیں۔

آخری زمانے کی شدتِ لطافت یہ تھی کہ کہاں سفر شاذ و نادر ہی اختیار فرماتے تھے، اب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اگست سنہ ۱۹۵۹ء میں ناگپور آخری سلام کر آئے۔ شریعتِ جسمانی پوری کی۔ نومبر سنہ ۱۹۵۹ء میں جسمانی حالت یہ تھی کہ بہت تکان چہرۂ مبارک سے ظاہر ہوتی تھی۔ کراہنے کی ہلکی ہلکی آواز آتی تھی۔ یہ کیفیت ایک سال سے بھی زائد رہی۔ مگر اس ماہ میں ہی بارہ روز کے اندر تین مرتبہ ویزاک تشریف لے گئے۔ ۳۰ نومبر کو اندر کے مکان سے باہر کے کمرہ میں تشریف لے آئے کہ خلقت سے اور نزدیک ہو جائیں اسی دن دربار کے اجلاس میں خوب گھنٹی بجوائی۔ اور فرمایا خوب گاؤ، خوب گاؤ ایسا کہ جسم میں عشق کی گرمی آجائے۔ دسمبر میں اننت گری سے بھی آگے دور تک سیر کی۔ اور فرمایا۔ اپنی مرضی سے جتنی دور چاہوں جاؤں گا و گرنہ جے پور سے واپس

آجاؤں گا۔ یہ خیال رہے کہ فقیر کا ایک قدم بھی بے معنی نہیں ہوتا
ہر سفر جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ایک رمز ہوتا ہے۔ قدم
اس عالم میں اُٹھ رہے ہوتے ہیں کہ اور سیر دوسرے عالم میں
ہوتی ہے۔ جب سارا وجود ہی آیت اللہ ہو تو ہر عمل میں ظاہری
اور باطنی شریعت الٰہی دونوں ہی پوری ہوتی رہتی ہیں۔ جب
بطنِ قرآن میں طبق در طبق مختلف معانی اور اسرار پوشیدہ ہوں
تو ام القرآن۔ قرآنِ ناطق ذات میں کیا کچھ اسرار ورموز نہ
ہوں گے۔ دسمبر ۵۹ء ہی میں حکم دیا کہ لال میٹے پر جو چھوٹے
مکان شکستہ کھڑے ہیں ان کو صاف کر دو۔ اس جگہ ہم دفن ہوں
گے۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی اور رہیں گے۔ ڈرو نہیں۔ پھر ایک روز
حکم دیا کہ اس کمرہ کے پیچھے جہاں اب قیام تھا۔ پچاس گز لمبی اور
دس گز چوڑی فصیل لگوا دو۔

۶۰ء کے آغاز میں کئی بار پاکستان۔ افغانستان۔ بغداد
عرب۔ اٹلی جانے کا ذکر کیا۔ اور یہ کہ حج پر جائیں گے۔ فرمایا حج
پر جانا کیا۔ ہم یہیں سے دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے فرمایا
لوگ پاکستان جانے کو کہتے ہیں۔ کیا افغانستان بھی جانا ہو گا۔ میں
کہیں نہیں جاتا۔ سیدھا پاکستان سے عرب اور واپسی ہوائی جہاز

سے بمبئی کے راستہ سے۔ حج کا زمانہ آیا تو دربار میں تین صفوں میں کثیر تعداد نے معہ بابا جان کے نماز ادا کی۔ فرمایا تم سب کا یہیں حج ادا ہو گیا۔ لکھ دو یہ بات ان لوگوں کو جو ہم کو حج پر لے جانا چاہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۶۰ء میں بجواڑہ۔ کھم میٹ۔ بورگم پاڈ تشریف لے گئے۔ اور آٹھ روز کیمپ کیا۔ بےحد ہجوم خلقت کا اور بابا جان کے چاہنے والوں کا رہا۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۶۰ء کو ہوائی جہاز سے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ اور ۳ر اگست کو واپس تشریف لائے۔ اس سفر کے بعد ہی پیر ورم کر آئے۔ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی سہارا لے کر دربار تشریف لاتے رہے۔

آخری جشن

گذشتہ سال کے جشن میں فرما دیا تھا کہ اگلا جشن بہت شاندار رہے گا۔ ۳ر ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ مطابق ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۰ء کو جشن کا دن تھا۔ اور یہاں کچھ دن قبل یہ کیفیت کہ روانگی کی بالکل تیاری سخت طبیعت علیل۔ خدام مغموم۔ آنکھیں اشکبار۔ حضور کا فرمان کہ ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب ہم جاتے ہیں۔ نظروں سے چھپ جائیں گے مگر جاتے کہیں نہیں۔ تمام حساب کے مطابق عین جشن کے



عید نظارہ

دن ہی وصال ہونا تھا۔ جشن کی تیاری دُکھے دل کیا کرتے۔ نہ زبان سے حضور کی رخصت ہونے کا خطرہ ظاہر کر سکتے تھے اور نہ ہی ہاتھ کام کرنے کو اُٹھتے تھے۔ ۲۲ ستمبر کی شام جب ایک عزیز خادم پہنچے تو یہ حالت تھی کہ دروازہ حضور کے کمرہ کا بند تھا اور مجاور صاحب اور دیگر خدّام باہر کھڑے رو رہے ہیں۔ ان خادم کی رسائی ہوئی۔ دور دراز کے رہنے والے بچے اس چھوٹے سے عبد کو دیکھ کر باپ کی محبّت بھی عود کر آئی۔ اپنی، اپنے بچّوں کی بازی اگر کوئی لگا دے تو شفیق باپ مہربان ہو ہی جاتا ہے۔ وہ کیفیت باباجان کی آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہوئی اور ۲۳ کی شام کو رات گئے طے ہوا کہ جشن منایا جائے گا۔ اور حضور باہر تشریف لائیں گے۔ رات بھر خدّام دربار سجاتے رہے اور تیاریاں ہوتی رہیں۔ جشن کی صبح دربار میں وہی سابق روایتوں کے مطابق گہما گہمی ہونے لگی۔ باہر صبح سویرے سے شہنائی کی سریلی آواز شروع ہوئی۔ پھر سے زندگی کی بہار آئی۔ کہیں گانے، کہیں قوّالی، کہیں قرآن خوانی۔ مگر تمام میں محبّت کے اظہار کی وجہ سے ایک ایکائی، ایک ہم آہنگی۔ ہر طرف ایک خوشی کا عالم تھا۔ یہاں تک کہ اپاہج، لولے، لنگڑے، دلگرفتہ، زمانہ کے زخم خوردہ

سب ہی اپنی تکالیف بھول گئے تھے۔ دربار جو کل اداسی کا نمونہ تھا، آج عید کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ دن نکلا تو فدائیوں کا بے پناہ ہجوم۔ ذات پات۔ مذہب و ملّت سے بلند ہو کر ایک یگانہ ہستی بن کر حضور پر پروانہ وار فدا ہونے کے لئے جمع ہونا شروع ہوا۔ آج حضور کو کُرسی پر بٹھا کر دربار لایا گیا تھا۔ اور تخت پر پہلی بار کُرسی لگا دی گئی تھی۔ لوگ آیۃ الکرسی پڑھا کرتے ہیں مگر خوش قسمت آنکھیں آیۃ الکرسی کی تفسیر کو ساتھ ساتھ مادیت کے رنگ میں بھی دیکھتی جاتی تھیں۔ وَسِعَ کُرسِیُّہُ السمٰوٰتِ والارض کا نقشہ اس آخری جشن کے دوران بار بار پیشِ نظر رہا۔ حضور علالت کے باوجود پورے صبر کے ساتھ ہر ایک کی دلجوئی فرماتے رہے۔ وہی بہتا دریا حُسنِ معنی کا۔ جو بھی موتی رول لے۔ مگر کم لوگ ہی ان باتوں کی گہرائی کی طرف دیکھتے تھے۔ پھر بھی دریا کو کیا، کوئی موتی چُنے نہ چُنے۔ وہ اسی طرح رواں۔ ایک شام قبل فرمایا تھا۔ بہت سی مچھلیاں بازار میں آئی ہیں۔ مجھے مچھلیاں (مُتلاشیانِ حق) بہت پسند ہیں۔ پاکستان سے جو جماعت ایک نشانی کے طور پر پیش ہوئی۔ اس کی بابت فرمایا۔ دیکھو ہر طرف پشاور ہی پشاور ہے۔ اور دیکھنے والی آنکھوں نے واقعی دیکھا کہ سارا



دربار تشریف آوری

دربار اسی طرف کے لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور اسی عالم مثال کے مجمع میں ایسے ایسے نظر آئے کہ جو ادھر نہ تو گئے تھے، نہ ایک ہی شہر کے تھے۔ پھر فرمایا۔ پشاور والے اتنے بڑے کہ ویزاک والے دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔ پشاور کی چائے پکانی بہت پڑتی ہے۔ تب رنگ کھلتا ہے۔ کھانے کے وقت بھی فرمایا۔ سب کھانا لے جاؤ پشاور والوں کے لئے۔

اس جشن میں پس پردہ وہی نقشے چلتے رہے۔ جو گذشتہ جشنوں میں ہوا کرتے تھے۔ مادی دنیا میں بھی اور آفاقی میں بھی۔ ایک خادم کا کہنا ہے۔ آج سپریم کورٹ میں کیس پیش تھے۔ سب ہی میں کامیابی ہوئی۔ یہ عجب رنگ دیکھا کہ دربار لگنے کے بعد اور قدمبوسی سے سرفراز کرنے کے بعد بابا جان کے چہرہ پر نکھار آ جاتا تھا۔ اور نیاز مندوں کے چہروں پر بھی۔ سب کے سب شادمانی اور کامرانی کی تصویر نظر آنے لگتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ حضور جس وقت دربارِ عام میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو اس لامحدود رحمت کے سمندر سے نسبت اور رشتہ ہوتا ہے اور در کھل جاتے ہیں، اور خدمت کے ذریعہ جہاں خلق کی سیرابی ہوتی ہے۔ اس وجود کی کسی جو ذریعہ ہے سیرابی کا۔ دربار لگنے کی صورت یہ رہی کہ دن

میں کئی کئی بار تشریف لاتے رہے۔ البتہ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ یہ بھی ہوا کہ رات کے بارہ بجے جب محفلِ میلاد ہو رہی تھی تشریف لے آئے۔ اور کئی ایک کی قسمتیں کھُل گئیں۔ کچھ لوگوں کے دل میں یہ بھی خیال گزرا کہ ان ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں بابا ہمیں کیا پوچھیں گے۔ مگر دیکھنے والا سب کو دیکھ لیتا ہے۔ سب کے قلوب سے واقف ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا۔ ایمان اس ہزاروں کے مجمع کو دیکھ کر پختہ ہو گیا ہے کہ کس طرح سب کی خبر لیتے ہیں ـــــ ربّ العٰلمین جب یہ کرتا ہے تو یہ آسان ہے۔ شام کی مجلس میں پاکستان سے آیا ہوا کشمیری لباس زیبِ تن تھا۔ پاؤں میں راجپوتی جُوتی تھی پائوں سوجے ہوئے ہونے کی وجہ سے جُوتی اتار لی گئی تھی۔ لوگوں نے اس نعلین مبارک کو سر پر لگانا شروع کر دیا تھا۔ عجب دل ہلا دینے والا نقشہ تھا۔ کچھ اہلِ دل رو دیئے۔ اور کہا کہ قسمت والے لوگ تھے۔ یہ رمز عشق کے کوئی کیا جانے۔ بڑے بڑوں کو راستہ کا پتہ نہیں ہوتا۔ وِرد و وِید یتے ہیں۔ یوں راستہ جانے ہوئے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مہربانی کریں تو راستہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ اور مہربانی کریں تو انگلی پکڑ کر ساتھ بھی لے جاتے ہیں۔ لیکن گود میں اٹھا کر لے جانے والے تاریخ میں کم ملیں گے۔



حُجرۂ مبارک کی معنویت

۲۴ ستمبر کو فرمایا تھا۔ کل بارش ہو گی۔ تو واقعی ایسا ہی ہوا۔ کہ ۲۵ کو اتنی کرم کی بارش کہ بار بار دربار تشریف لائیے۔ بار بار فدائیوں کا ہجوم دیدار اور قدمبوسی سے مشرف ہوا۔ اور اپنے دل کی آرزوئیں عرض کرتا رہا۔ عجب شانِ محبّت تھی جیسا کہ ماں اپنے بچوں کے لئے بار بار تڑپ کر ان کے پاس آئے۔ انسان کتنا اور اس کی محبّت کتنی۔ مگر جب اس عظیم محبت کو دیکھے جو ایک مرکز عالم کو مخلوق سے ہوتی ہے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ یہ ساری دنیا کا بوجھ۔ یہ ان کے دکھ درد کا بوجھ۔ یہ ان کی محبتوں کا بوجھ کون برداشت کر سکتا ہے۔ حق کی محبّت کی جھلک، دنیاوی آنکھیں کیا دیکھ سکتی ہیں۔ یہ ان کے وہم اور تخیل سے پرے کی بات ہے۔ یوں شام کو خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی بھی کڑکی اور کئی بار اندھیرا ہو کر روشنی آئی۔

۲۶ ستمبر کو ویزاک کا سفر فرمایا۔ ۲۴ آدمی ساتھ تھے۔ یہ سفر کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گودی میں اُٹھا کر منزلیں طے کرائی جا رہی ہوں۔ فرمایا آج پورٹ پر جا کر مچھلیاں پکڑیں گے۔ سب مچھلیاں پکڑیں گے۔ ویزاک سمندر ہے۔ موج ہے۔ کنارہ ہے۔ راستہ میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ تو فرمایا۔ پانی بہہ رہا ہے۔ پھر کسی سے دریافت کیا۔

اس موٹر کا ڈرائیور کون ہے۔ ویزاک پہنچ کر دو ایک گھروں میں قیام فرمایا۔ پھر ساحلِ سمندر سے گزرتے ہوتے واپس لوٹے۔ لائٹ ہاؤس کے قریب ایک جہاز لنگر انداز تھا۔ وزیری کتّا اس سفر میں ساتھ نہ تھا سُنا ہے پیچھے کافی روتا رہا۔ اب ایک نیا روسی نسل کا کتا بابا جان کے دربار میں پیش ہوا ہے اور دو بلّیاں واپس کر دی گئیں ایک ایرانی اور ایک سیامی۔ اور ان کی نگرانی کسی اور کے سپرد کر دی گئی۔ ویزاک سے واپسی پر فرمایا دریا کو کیسے دیکھیں اندھیرا ہے۔ ودیانگر کے قلعہ کے قریب فرمایا۔ قلعہ نزدیک آگیا۔ چراغاں ہو رہا ہے۔ یہ باتیں اپنی اپنی جگہ پر رموز سے پُر ہیں۔ مگر یہ موتی وہی خوش نصیب چُنتے ہیں جو ہر ادا پر مر مٹتے ہوں اور جن کے دل، ہر عمل، ہر گفتار پر آمنّا صدّقنا کہنا جانتے ہوں۔

۲۷ ستمبر کو پاکستان والوں کی واپسی تھی۔ آج تو حضور دربار میں بار بار ہی تشریف لاتے رہے۔ کرسی پر بٹھا کر لوگ لاتے سب کو دیدار دکھاتے اور پھر واپس تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ دن بھر جاری رہا۔ شام کو رخصت کے وقت سلام پڑھا گیا۔ اس وقت بابا جان کی نگاہوں کا یہ انداز تھا کہ عمر بھر ایسا نہ دیکھا گیا تھا۔ یہ رخصت ہو بھی چکی۔ تب بھی نو بجے شب دربار میں تشریف لے آئے اور



نیازمندان از پاکستان

ہر ایک پر ایک نگاہ ڈال کر فرمایا۔ چلا جاتا ہوں۔

آج صبح دربار کا عجب رنگ تھا۔ قلندریہ شاہی لباس زیب تن تھا اور مجمع عام کو شرفِ زیارت اور قدمبوسی عطا فرما کر جب حضور واپس چلے تو چھوٹے چھوٹے خوش پوش بچے، رنگین تیر و کمان لئے دورویہ کھڑے ہو کر جے جے کے نعرے لگاتے رہے۔ سبحان اللہ، کیا نقشہ۔ کیا کیفیت، کیا رنگ اس میں تھا۔ جے ہو۔ اس سے زیادہ سرخروئی سے واپسی کی تصدیق زائرین کو اور کیا مل سکتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا امت کے لئے پیام نصرت دیا جا سکتا تھا۔ ان ہی نشانیوں میں اور ایسی ہزار نشانیوں میں انسان حق کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور حق کے رمز سمجھ کر ایمان پختہ کرتا جاتا ہے۔

دربار کے در و دیوار، ستون، تخت کے اوپر لگی ہوئی لالٹین دربار میں پالے ہوئے جانور، دربار کے علاقہ میں لگے ہوئے درخت تمام کے تمام رموز سے پُر ہیں۔ ہر چیز تقریباً نشانی ہے کسی چیز کی۔ یہ نشانیاں کچھ تو دائم قائم ہیں۔ کچھ بدلتی رہتی ہیں۔ انسان خود آیۃ اللہ ہے۔ مگر پہنچے تو اس مقام تک اپنی حالت بدل کر دل کے راستے۔ یہ باتیں نہ عقل کے میدان کی ہیں۔ نہ عقل کی رسائی ان حدود میں ہے عشق جاگے۔ دل کی دنیا میں اُتریں تو محبوب کی ہر ادا

میں رنگینی پائیں گے۔ پھر جب محبوبیت میں اکملیت ہو تو سوائے حق کی کھلی ہوئی کتاب کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ مادی چیزوں کے پیچھے نگاہ دوسرے ہی رمز دیکھنے لگے گی۔ قرآن کے الفاظ "ہماری نشانیوں پر غور کرو" بے معنی بات نہیں۔

علالت

۷ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کو بائیں جانب فالج کا حملہ ہوا۔ دسمبر تک ہاتھ تو ٹھیک ہو گیا۔ مگر علاج معالجہ وہی فقیری شان والا ہوتا رہا۔ کبھی تھوڑا افاقہ ہو جاتا۔ کبھی پھر وہی ناسازئ طبع لطافت کی منازل انسانی فہم و ادراک سے طبق در طبق اوپر ہوتی ہیں۔ فقیر مکمل قدرت رکھنے کے بعد اگر آئینہ دار ہوتا ہے تو عالم کے احساسات اور جذبات کا۔ جن ہستیوں کا رجوع عروج کی طرف ہو ان کے پاؤں زمین پر جمائے رکھنا صرف صادق مریدین کی قلبی کیفیت سے ہی ہو سکتا ہے یا دُکھے ہوئے دلوں کی دادرسی کرانے میں، یا اُمّت کا بوجھ اُٹھائے رکھنے میں۔ مخلوق میں پھیلا کر۔

ایک دن باباجان اندر آرام فرما رہے تھے کہ ایک فقیر صاحب دربار میں تشریف لائے۔ فرمایا ناگپور سے آیا ہوں۔ مجاور عبدالشکور صاحب کو بتایا۔ بیٹا کسی کو بتانا نہیں۔ اسی طرح بھیس بدل کر دربار

شاہی میں پہنچنا ہوتا ہے۔ کچھ تحفے ساتھ لائے تھے۔ فرمانے لگے اگر شہنشاہ سو رہے ہوں تو کیلے کے گیل پلنگ کے نیچے رکھ دینا۔ اور یہ دو گلاب کے پھول پاؤں میں رکھ دینا۔ خادم یہ چیزیں اندر لے کر پہنچے تو دیکھا کہ بابا جان بیٹھے ہوئے ہیں۔ واقعہ عرض کیا تو فرمانے لگے کہ وہ ایک عاشق اور خدا پرست ہے۔ یوں ایک دن قبل بابا جان بتا بھی چکے تھے کہ کل دربار میں شیر آئے گا۔ ان فقیر صاحب سے ملاقات کرنے بابا جان سہارا لے کر باہر تشریف لے آئے تو ان صاحب نے بابا جان کی قدمبوسی کی اور جب بابا جان رخصت ہونے لگے تو یہ فقیر صاحب ہاتھ کا سہارا دے کر گھر کی ٹٹیوں تک پہنچانے گئے اور بلائیں لیں۔ بابا جان اندر تشریف لے گئے تو ان فقیر صاحب نے مجاور صاحب سے فرمایا۔ محبّت تجھ کو زیادہ ہے، رومت۔ صبر کر۔ کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے دیا کر۔ شہنشاہ کا یہ آخری وقت ہے۔ جسم میں خون نہیں ہے۔ یہ فقیر صاحب مجاور صاحب کو اپنی چائے کی پیالی بھی دے گئے تھے۔ اور مجاور صاحب کافی عرصہ مجذوبیت کی حالت میں رہ کر بالآخر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آخری ایّام

دسمبر ۱۹۳۰ء کے پہلے ہفتہ میں جمعرات کو بخار چڑھا۔ جمعہ کو

اتنا شدید رہا کہ قبلۂ عالم بیہوش رہے۔ سنیچر کو کچھ آرام ہوا تو وہی رحمت کا جوش کہ اتوار کو کرسی پر برآمدہ میں لوگوں نے بٹھایا اور حضور نے پروانوں کو دیدار دیا۔ لوگوں نے عرض کی ابھی تشریف نہ لے جائیں۔ شان کے واسطے دیئے۔ دور دراز کے لوگوں کے واسطے دیئے کہ سب حضور کی صحت کے لئے بیچین ہیں تو فرمایا جو حالت دیکھ رہے ہو وہی لکھ دو۔ خادموں نے رونا شروع کیا تو خود بھی متاثر ہوئے مگر فرمایا۔ میں رہ کر کیا کروں۔ جو کچھ رہ کر کرتے ہیں وہی پس پردہ بھی ہوتا رہے گا۔

دوسری صبح کو حضور نے تین بکرے کٹوا کر غریبوں کو کھانا کھلایا کہ یہی سب سے مرغوب مشغلہ تھا۔ دربار میں کرسی پر بیٹھ کر تقریباً روزانہ ہی تشریف لانے لگے۔ کچھ خادموں نے جانے کی اجازت طلب کرنی شروع کر دی۔ تو حضور کو یہ بات پسند نہ آئی۔ محبّت بھرا دل جدائی کب گوارہ کر سکتا ہے۔ کچھ دن میں بیماری نے زور پکڑا۔ سارے بدن میں درد رہنے لگا۔ مُنھ پک گیا۔ بلغم کے ساتھ خون آنے لگا مگر طالبان کا ہر وقت خیال رہتا۔ حضور نے بار بار فرمایا ہم پاکستان جا کر آئیں گے۔ مچھلی ملتی ہے کیا۔ جب تک مچھلی نہ ملے گی میں سر کے بال نہ اتاروں گا۔

جنوری ۱۹۶۱ء آگیا۔ دربار کے لوگ آپس میں رنجشیں کر کر کے علیحدہ ہونے شروع ہوئے۔ اور ادھر بیماری میں الٹ پھیر جاری رہی نازک دلوں کی محبت کا نازک قلب ہی کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنے بچوں کی جدائی کیسے برداشت ہو سکتی ہے۔ ان ہی ایّام میں علیحدہ علیحدہ کچھ خادموں کی بشارتیں سُن کر بابا جان نے فرمایا۔ پاکستان جاکر تمہیں رسولِ خدا کا دوبارہ دیدار ہوگا تو یہ کہنا کہ پہلے تو اسے دیکھ لیا پھر دوسری دفعہ تمہیں۔ یہ بات بھولنا نہیں ہے۔ کہنا ہے۔ یہ بھی فرمایا۔ ایک چھپا رستم ہے جس نے تمہاری چیز دبا رکھی ہے۔ جیسا جیسا تبا تا جائے کرتے جاؤ۔ سینہ روشن ہوتا رہے گا۔ دین دنیا ملے گی۔

جنوری کے پہلے ہفتہ میں فرمایا۔ میٹھے پانی کا تالاب دریا بن گیا۔ میٹھا دریا اور کھاری دریا دونوں مل جائیں گے۔ بار بار اس زمانہ میں بھی اور اس کے بعد بھی فرمایا۔ پاکستان جاؤں گا، عربستان جاؤں گا، ناگپور جاؤں گا۔

۹ جنوری ۱۹۶۱ء کو بخار کی شدّت ہوگئی۔ پھر بھی دربار تشریف لائے۔ اور پھول معمول سے بہت زائد مقدار میں لوگوں کو دیئے۔ آج سے ہی مرض کی شدّت بہت بڑھ گئی۔ اب زبان سے فرمائے ہوئے الفاظ کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ یہ سلسلہ بیماری کا کچھ دن جاری رہا۔

دربار پھر تشریف نہ لا سکے۔

جمعرات ۲۶ر جنوری کو ۱۱ر بجے رات کسی خادم کو فرمایا میں چلا جانا چاہتا ہوں تم لوگ کھاپی کر خوش رہو گے۔ پھر ایک اور خادم کو بلوا کر فرمایا۔ مجھے مت روکو۔ پھر کسی اور سے فرمایا اچھی طرح سب دربار کے انتظام چلتے رہیں گے۔ میں کہیں غایب نہیں ہوتا۔ صرف تم لوگوں کو نظر نہ آؤں گا۔

جمعہ ۲۷ر جنوری ۱۹۶۱ء مطابق ۹ شعبان ۱۳۸۰ھ بھٹمانیا کا وشی کے دن صبح ۵ بجے سے نازک حالت ہوگئی۔ سانس میں غرغر کی آواز آنے لگی۔ دن چڑھے گیس دی گئی تو کوشش کر کے فرمایا۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ گیس کی نلکی ہٹادی گئی۔ سوا بجے دوپہر کے وقت حضور نے رحلت فرمائی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

ہزاروں فدائی اطلاع ملنے پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آبِ زمزم اور گلاب سے حضورؒ نے غسل فرمایا اور ناگپور کا لہریا غلاف اوڑھ کر سنیچر کی ۳ر بجے شام لال مٹے پر اپنی بتائی ہوئی جگہ پر آرام فرمایا۔ لاکھوں سلام ان پر جو ظاہر میں بھی سراپا رحمت تھے اور پردہ میں بھی سراپا رحمت ہیں۔ نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ دور دراز کے لوگوں

کے لئے اور مخلوقِ عالم کے لئے۔ یہ روشنی اب دنیا عرصہ تک نہ دیکھ سکے گی۔ ایسی ہستیاں ہزار سال میں ہی آتی ہیں۔ خود بھی فرمایا تھا۔ میرے فوراً بعد ایک بزرگ اور آئیں گے۔ مجھ جیسا اب نہیں آتا۔ کوئی آیا بھی تو تین سو سال بعد۔ مگر یہ بات کہاں۔ ایک نہیں کئی ہستیاں شاہد ہیں کہ ایک دور دراز جگہ پر غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی تو حضور خود موجود تھے۔ یوں نیازوں کے موقعوں پر بھی اور تنہائی میں بھی حضور کی زیارت لوگوں کو ہوئی ہے۔ اور بعض خوش نصیبوں کو معہ جسم کے۔ عام لوگ شاہد ہیں کہ پردہ کے بعد ان کی خواہشیں اب زیادہ پوری ہو رہی ہیں بہ نسبت پہلے کے۔

طالبانِ صادق جانتے ہیں یہ نور زیرِ زمین نہیں جاتا۔ فنا ہونے والی چیز فنا ہوتی ہے۔ بقا کو فنا کہاں۔ یبقٰی وجہ ربك جاری ساری ہے۔ یہ نور ازلی ایک بدن چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے اور مقید بھی نہیں ہوتا۔ نور کو نہ فنا ہے نہ اس کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ کُلَّ یومٍ ھُوَ فِی شَانٍ ظاہر بھی وہی باطن بھی وہی اوّل بھی وہی، آخر بھی وہی۔

ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ہ

آبروئے حیات ہیں یہ لوگ
حاصلِ کائنات ہیں یہ لوگ

ایک کونے میں گو سما جائیں
وُسعتِ شش جہات ہیں یہ لوگ

زندگانی تو آنی جانی ہے
زندگی کا ثبات ہیں یہ لوگ

ہیں یہ عرفان اور یہی وجدان
قلب کی واردات ہیں یہ لوگ

بے سُنے مست بے کہے گویا
لاکھ باتوں کی بات ہیں یہ لوگ

کامرانی کی انتہا پر بھی
دل کی بازی سے مات ہیں یہ لوگ

دیکھ لیجیے وجودِ قادر کو
حق نما حق صِفات ہیں یہ لوگ

(رحمان بابا)

تری تلاش میں دشتِ خیال تک پہنچے
جو قیل و قال سے گزرے تو حال تک پہنچے
کھٹک رہے تھے نگاہوں میں حسن کے جلوے
دل و نگاہ سے گزرے جمال تک پہنچے
بلاکشانِ محبت کی مستیاں توبہ
مئے حیات سے کیفِ جلال تک پہنچے
جراحتوں سے تو بھرپور ہیں جگر سب کے
مزا تو جب ہے کوئی اندمال تک پہنچے
سرابِ عقل میں کھوئے گئے ہنر والے
جو بے ہنر تھے وہ کسب و کمال تک پہنچے

(رحمٰن بابا)

باب ۱۷

بچّے

یہ ناگپور کا محاورہ ہے کہ مریدین کو "بچے" کہتے ہیں۔ اہلِ طریقت تو جہاں تک ہو سکے پیغامِ حق کو زیادہ سے زیادہ نشر کرنے کے لئے تربیت و اصلاح کے بعد زیادہ سے زیادہ مریدین بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ضرور مریدین بھی کافی حد تک اس رشد و ہدایت سے مستفید ہوتے ہیں۔ مگر اہلِ حقیقت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اپنے تمام ایامِ ظہور میں دو چار، آٹھ دس سے زیادہ صحیح معنیٰ میں مرید نہیں بناتے۔ آپ خود سوچیے کہ آپ کے چار چھ "بچے" بھی ہوں تو ان کی پرورش کا بوجھ، ان کی نشو و نما کی ذمہ داری، ان کے دُکھ سُکھ کے اثرات۔ یہ سب کتنا بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ پھر یہ تو دنیا کے "بچے" ٹھیرے محبّت اور تعلق اپنی جگہ صحیح مگر جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن روحانی "بچے" تو وہ ہیں جن کی ذمہ داری قیامت تک ختم نہیں ہوتی۔ ان کی رُوح کی تولید، بچپن میں ماں باپ کی طرح دودھ دینا۔ اپنے ہاتھوں سے نرم نرم صحت آور غذاؤں کا کھلانا، صحیح تعلیم و تربیت۔ کبھی

شفقت تو کبھی سختی۔ پھر جب جوان ہو جائیں تو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا۔ اور کوئی خدمت ان کو سپرد کرنا۔ انفسی اور آفاقی تلاطم سے ان کی حفاظت کرنا اور طریقت کے راستہ پر دل کو ذاکر کر کے کسی اسم کا بخش دینا کہ تم کماؤ اور کھاؤ۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ آخری وقت میں جس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دست گیری کر کے باایمان اس دنیا سے اٹھانا۔ پھر قبر کی حالت اور روحانی زندگی میں تا قیامت اپنے سایہ میں رکھنا اور حشر میں شافعِ اُمم کا دامن تھما دینا۔ اور اللہ جانے ان ذمہ داریوں کے علاوہ کیا کیا اور کس کا حوصلہ ہو سکتا ہے، یہ کون کر سکتا ہے۔ حقیقت کے راستہ میں مرید کرنا کوئی کھیل نہیں۔ آخر کیوں کوئی کسی کی ذمہ داری لے اور وہ ذمہ داری جو شاید کروڑوں سالوں میں بھی ختم نہیں ہوتی۔ آپ خود سوچیئے چاہے آپ کتنے ہی خوش حال کیوں نہ ہوں۔ کوئی یتیم غریب بچّہ آپ کے پاس آتا ہے اور اپنی غم پرورده آنکھیں آپ کی طرف اٹھا کر آپ سے یہ درخواست کرتا ہے کہ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ مجھے آپ اپنا بچّہ بنا لیجیئے۔ آپ کو رحم ضرور آتا ہے اس کو کھانا بھی کھلا دیں گے۔ کپڑے بھی پہنا دیں گے اور کچھ روپیہ بھی دیدیں گے۔ مگر یہ کہہ دیں گے۔ جاؤ بیٹا دنیا وسیع ہے

اللہ مالک ہے۔ ذمہ داری سے کترا جائیں گے۔ بیٹا بناتے کا حوصلہ نہ ہوگا۔ یہ تو صرف دنیا کی ذمہ داری ہے۔ چار دن کی بات ہے اسی سے آپ گھبرا جاتے ہیں۔ پھر سوچیے کہ اس ابدی ذمہ داری کو کوئی کیوں قبول کرے۔

مگر واہ رے تیری شان۔ واہ رے تیرا ظرف۔ سمندر کو اس کی کیا پروا کہ کتنے نالے ندیاں مجھ میں آکر گرتے ہیں۔ ان چیزوں سے نہ سمندر میں کمی ہوتی ہے، نہ زیادتی۔ یہی حال وجے نگرم کے دربار کا دیکھا گیا ہے۔ یہ دولتِ سرمدی جس کے لئے بادشاہوں نے اپنی سلطنتیں چھوڑ دیں۔ جس کے لئے فقیر چالیس چالیس سال کمروں میں بند ہو کر دن رات ریاضتوں میں لگے رہے۔ وہ موتی وہ گوہر جس کی قدر شاہ بداند یا بداند جوہری، ایسے بکھرے جاتے ہیں، جیسے مُرغ کے آگے دانے۔ مگر معلوم نہیں اس میں نصیبوں کا دخل ہے یا کوشش پیہم کا۔ ان ہزاروں میں سے جن کو یہ دولت مفت تقسیم کی جاتی ہے۔ کوئی ایک اس کو پکڑ لیتا ہے۔ اپنا لیتا ہے۔ پھر اسے بہت کچھ ہی نہیں سب کچھ مِل جاتا ہے۔ وہ مقامات اور منزلیں، وہ آزمائشیں اور ریاضتیں جو اگلے زمانوں میں بیس بیس سال کی سخت کوشش سے کرم اور توجہ کے بعد طے ہوتی تھیں وہ چٹکی بجاتے

میں طے ہوتی ہیں۔ مگر وائے زمانہ اس کے قدر دان بہت کم ہیں۔

بابا قادر اولیا چاروں سلسلوں میں بیعت فرماتے ہیں جس کو جیسے دیکھا اسی کے مطابق اس کو بیعت فرمایا۔ چشتیہ سلسلہ تو عام ہے۔ اس میں ذات پات کی کوئی قید نہیں مگر قادریہ سلسلہ میں بہت احتیاط برتی جاتی ہے اور عام لوگوں میں سے صرف کلمہ گو کی قادریہ سلسلہ میں بیعت کی جاتی ہے۔ جب ان کی پوری تعلیم و تربیت ہو چکی ہوتی ہے۔ اور ان کے خون میں بھی کچھ جوش ہوتا ہے تو ان دونوں سلسلوں کے مابین نقشبندیہ اور سہروردیہ سلسلہ میں بھی بیعت کی جاتی ہے۔ غرض جس کو جس قابل سمجھا جاتا ہے یا جیسی نظرِ کرم اور جیسا لطف و عنایت ہو۔ بعض لوگوں کو چاروں ہی سلسلے بخشتے جاتے ہیں۔ عام لوگوں میں سے کسی کو کوئی سلسلہ عطا ہوتا ہے کسی کو کوئی۔ ایسے فقیر جو کسی خاص سلسلہ سے پہلے ہی سے وابستہ ہوں اور صاحبِ نسبت بھی ہوں ان کی اسی راستہ پر دست گیری کی جاتی ہے جس پر وہ پہلے سے ہیں۔ اور ان لوگوں کو ان کے مقامات اپنے لطف و کرم کی گود میں لے کر طے کرا دیتے ہیں۔

ذیل میں چند بچّوں کا ذکر درج ہے۔ اس میں ہر بچّہ کا

ذکر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ اب خدا جانے یہ لوگ کہاں ہوں اور کس حالت میں ہوں اس کا علم تو اسی کو ہوگا جو ان کا بوجھ اٹھا رہا ہے۔

۱۔ پانی والے بابا

نام محمد عثمان حافظِ قرآن تھے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی تار محمد ایوب کمپنی کے وجے نگرم کے ایجنٹ تھے۔ متمول تھے۔ تین ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ اور خرچ ملتا تھا۔ ۲۲ء یا ۲۴ء کا ذکر ہے جبکہ بابا قادر قبلہ ناگپور سے لوٹ کر ان چٹانوں پر چھوٹی سی کٹیا میں تھے۔ اور چاروں طرف خوفناک جنگل بابا صاحب کی خدمت کے لئے ایک سردار نامی شخص بچپن کا ساتھی تھا۔ عثمان صاحب اس زمانہ میں روزانہ بعد نماز فجر کچھ کھجور ساتھ لے کر سائیکل پر آتے اور جھونپڑی کے باہر انتظار کرتے۔ جب بابا صاحب باہر نکلتے تو عثمانی صاحب کھجوریں پیش کرتے۔ بابا صاحب ان میں سے ایک یا دو کھجور اٹھا لیتے اور عثمان صاحب باقی کھجوریں لے کر واپس شہر چلے جاتے۔ روزانہ کا یہ دستور، چاہے کوئی بھی موسم ہو بلا ناغہ ایک سال سے زیادہ جاری رہا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ عثمان صاحب نے قبلہ بابا صاحب

سے عرض کیا کہ حضور میں اللہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ تم تاب نہیں لا سکتے۔ کچھ اور مانگو۔ جب بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ خیر تم چالیس دن کے اندر اندر دیکھ تو لو گے مگر پا نہ سکو گے۔ کسی فقیر کے روپ میں ملاقات ہو گی۔ دیکھو چوک نہ جانا۔
محمد عثمان صاحب روزانہ راہ دیکھتے رہے اور ہر آنے جانے والے کی صورت کو تکتے رہے۔ مگر دل نے کبھی گواہی نہ دی کہ وہ یہی ہیں آہ وہ دل کی تڑپ اور وہ انتظار کی گھڑیاں ہر آہٹ پر کان، ہر پرچھائیں پر آنکھ جمائے ہوئے۔ اسی طرح پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ روزانہ حسب معمول قبلہ سے ملاقات ہوتی رہی مگر اس بات کا کوئی ذکر نہ آیا۔ ایک مہینہ کے بعد انتہائی مایوسی میں عرض کی کہ حضور ایک مہینہ بیت گیا۔ کوئی بھی نہ ملا۔ بابا صاحب قبلہ نے فرمایا "جا ملاقات ہو گی"۔ اسی طرح روزانہ باقی ۹ دن تک ایک مایوسانہ شکایت، اُدھر سے اطمینان کا جواب۔ انتالیس دن کے بعد عثمان صاحب نے عرض کیا کہ حضور چالیس دن ہو گئے ہیں۔ حکم ہوا۔ "جا آج رات ضرور ہو گی۔" پھر ایک امید کی لہر عثمان صاحب میں دوڑی اور گھر چلے گئے۔ رات کو معمولات سے فراغت پا کر تقریباً ۱۲ بجے وہ اپنے کمرہ میں موجود دوسری منزل پر

آرام کر رہے تھے اور ربِ ذوالجلال کے نقشے تصوّر میں گھوم
رہے تھے۔ کمرہ ہر طرف سے بند تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بوڑھا
فقیر شانے پر کمبل، ہاتھ میں لکڑی لیئے پائنتی پر کھڑا ہے اور
کہہ رہا ہے بابا میں بھوکا ہوں۔ ایک پیسہ خیرات کا دے دو
عثمان صاحب کو ان پر سخت غصّہ آیا کہ یہ کون مسافر ہے جو اتنی
رات گئے میری آرام گاہ میں گھُس آیا ہے۔ اپنے ملازموں کو
آواز دی کہ اسے باہر نکال دو۔ فقیر نے کہا۔ "بابا خفا کیوں ہوتے
ہو۔ دیکھنا کیا ہے مجھے ایک پیسہ دیدو میں خود چلا جاؤں گا۔"
فقیر کی اس ہٹ پر عثمان صاحب کو بہت غصّہ آیا۔ اور وہ چارپائی
سے اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ فقیر کو باہر دھکا دے کر نکال دیں۔ اس
پر فقیر دروازہ سے باہر چلا گیا۔ عثمان صاحب غصّہ کی حالت میں
اس کے پیچھے پیچھے دروازے کے پاس آئے تو فقیر ندارد اور دروازہ
اندر سے بند پھر بھی انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ کی اور
دروازہ کھول کر باہر آئے تو دیکھا کہ نوکر آرام کر رہے ہیں۔
اور صدر دروازہ بھی اندر سے مضبوطی سے بند ہے۔ ملازم کریم
خان کو بیدار کر کے اس سے دریافت کیا کہ وہ فقیر کدھر گیا۔ نوکر
نے پریشان ہو کر کہا۔ حضور یہاں کوئی نہیں آیا۔ دروازہ

دیکھیے کہ کتنی احتیاط سے بند ہے۔ عثمان خان صاحب اور ملازموں نے سارے مکان کی تلاشی لی مگر فقیر کا کچھ پتہ نہ چلا۔ کچھ شک اور کچھ حیرت کے عالم میں عثمان صاحب اپنے پلنگ پر آکر لیٹ رہے اور اس قصّہ کو بھول گئے۔ صبح سویرے حسب معمول کھجوریں لے کر بابا صاحب قبلہ کے پاس حاضر ہوئے اور پھر شکایت کی کہ حضور چالیس دن بھی ہو گئے۔ آپ کی بات تو پکّی تھی مگر آج بھی کچھ نہیں ہوا۔ بابا صاحب قبلہ پر جلال طاری ہو گیا۔ اور ایک بہت بڑی گالی دے کر جھڑک کر کہا کہ اے بدبخت وہ خود تیرے پاس آیا تھا اور کہا کہ بھوکا ہوں ایک پیسہ دیدو مگر تو نے جھڑک کر نکال دیا۔ یہ سننا تھا کہ عثمان صاحب آہ کا نعرہ لگا کر بے ہوش ہو گئے۔ اور زمین پر گر پڑے۔ سردار کو شہر بھیج کر ان کے رشتہ داروں کو بلوایا گیا۔ وہ لوگ عثمان صاحب کو اٹھا کر لے گئے۔ وہ چھ ماہ تک اس بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہے اس کے بعد ان کے ایک رشتہ دار ان کو اپنے وطن بھالوا کا ٹھیاواڑ لے کے چلے گئے۔

آج کل بھی محمد عثمان بالکل برہنہ لیٹے رہتے ہیں۔ کسی سے بات چیت نہیں کرتے۔ چاروں طرف پانی کے گھڑے رکھے رہتے ہیں۔ جو حاجتمند آتا ہے ان کو ان گھڑوں سے پانی دے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی گھڑے

ہیں عثمان صاحب خود ہاتھ ڈال دیں یا تھوک دیں تو میمن لوگ اس پانی کو نیلام کرتے ہیں اور ہزاروں روپے میں فروخت کرتے ہیں کہ لاعلاج امراض میں یہ پانی تیر بہدف کام کرتا ہے۔ آج کل محمد عثمان پانی والے بابا کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے فیض کا چشمہ جاری ہے۔

۳۔ محبوب علی

یہ آمین آباد ضلع گنٹور کے رہنے والے تھے۔ جب ۳۲ء میں وجے نگرم آئے تو اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ خاندانی پیشہ کے لحاظ سے سنگ تراش تھے اور نہایت تندرست، بے انتہا محنتی اور بظاہر ایک اچھے اور صالح نوجواں نظر آتے تھے۔ نہ معلوم ان کے دل کا کیا راز تھا اور انہیں کیا جستجو تھی۔ جب ۳۲ء میں اپنے قبلہ کے ساتھ پتھر کے کام کے سلسلہ میں یہ وجے نگرم آئے تو اوروں کے ساتھ یہ بھی سلام کے لئے بابا صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بابا صاحب کا چہرہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ سارے کام اور دنیا کے دھندے ختم ہو گئے۔ دن رات سر بزانو پڑے رہتے تھے۔ سوکھ سوکھ کر کانٹا ہوتے گئے اور ۳۷ء میں وصال ہو گیا۔ مزار آمین آباد میں ہے اور اس مٹی کے ڈھیر سے فیض کا چشمہ جاری ہے۔

آج جلوس کا دن ہے۔ یعنی بابا صاحب قبلہ کی پیدائش کا دن۔ قبلہ عالم تیار ہو کر دربار عام میں رونق افروز ہونے والے ہیں۔ نہ معلوم کتنے فقراء اور عشاق آنکھیں فرشِ راہ کیئے دیدار کے منتظر ہیں۔ اہلِ بصیرت یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ملائکہ کے ہجوم صف باندھے کھڑے ہیں اور حوریں پنکھا جھل رہی ہیں۔ حضور ابھی ڈیوڑھی کے اندر ہی ہیں کہ گنتوڑ والے شہنائی ساز ان ہی محبوب علی کی یاد میں ایک راگ چھیڑتے ہیں۔ اللہ رب ذوالجلال ایک تیر کی طرح شہنائی کی آواز دل کے پار ہو جاتی ہے۔ قبلہ عالم سر پر دونوں ہاتھ رکھے بالکل ساکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں سے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں۔ محبوب علی کی یاد میں آنسو تو نہیں مگر شبنم کی ایک چادر سی دونوں پلکوں کے درمیان ہے۔ غم و ترنم جو عشق کی حیات ہے جو سمندر سے بھی گہرا ہے۔ جس کی آبرو اور رعفت موتی کی آب سے کہیں زیادہ لطیف اور دل آویز ہے۔ آپ کی آنکھوں سے نمایاں ہے۔ شہنائی بج رہی ہے۔ قلبِ عاشق مصروفِ دیدار ہے۔ آہ محبوب تو کون تھا۔ آسمان کے تارے جو ایک دن میں اپنی چمک دکھا کر زمین پر ٹوٹتے ہیں، تیرے پاؤں کی گرد ہیں۔ بچپن سے تو نے ماں باپ کے ساتھ پہاڑوں اور چٹانوں میں اپنے دن

گذارے۔ وہ بڑی بڑی چٹانوں کی ہیبت اور وحشت، وہ دن کی تپش اور راتوں کا خوف تیرے ننّھے سے دل کو سہمائے ہوئے تھا۔ بڑی بڑی چٹانوں کو بارود کے دھماکے سے پھٹتے دیکھنا۔ پھر فولاد کی چوٹ سے ان کا ٹکڑے ٹکڑے کیا جانا اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے پہاڑوں کا انسان کے تصرّف میں آجانا تجھے حیرت میں ڈالے ہوئے تھا۔ تُو چٹانوں میں پلا، تیری طاقت تیری ہمّت تیرا عزم و ارادہ، تیرا دل خود ایک بہت بڑی چٹان تھا۔ تیری روح کی کشش ازلی گم کردہ آہو کی طرح ان چٹانوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ تجھے خود معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ تیری روح اس بات کی متلاشی تھی کہ اپنی ہستی کو کسی کے پائے ناز پر پاش پاش کر دے۔ تُو نے دنیا کے فریب اور رنگینیاں دیکھی ہی نہ تھیں۔ تو زندگی اور موت کے راز سے ناواقف تھا۔ حسن و عشق کے فسوں سے ناآشنا تھا۔ قسمت کسی بہانے سے تجھے اپنے مرکزِ حیات پر لے آئی۔ ایک دید کافی تھی۔ موسٰیؑ کو تو پھر بھی ہوش آگیا مگر تجھے دائمی مدہوشی نصیب ہوئی۔ طور جل کر سُرمہ سُرمہ ہو گیا تھا۔ مگر تیرا قلب پگھل کر پانی پانی ہو گیا۔

آہ محبوب! شہنائی کا سینہ بھی چھدا ہوا ہے۔ مگر اس میں وہ ظرف کہاں۔ جو تیرے دل کا راز افشا کر سکے۔ حضور

باباصاحب کی آنکھیں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں ایک شبنمی چلمن پتلیوں پر پڑی ہوئی ہے۔ اس چلمن کو کون اٹھائے اور ان کے دل کے بھید کون پائے۔

۳۔ فرید مستان

آپ وجے نگرم کے باشندے تھے۔ بیوی بچوں والے تھے۔ اور تمباکو کی دکان کرتے تھے۔ آپ غیر مسلم قوم تھے۔ اور سیدھے سادے خاموش نوجوان تھے۔ بظاہر آپ میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی تھی۔ آپ کے خاندان میں سات نسل پہلے راجہ کے یہاں کمانڈر انچیف تھے۔ جن کی بیوی نے راجہ سے اپنی عصمت بچانے کے لئے خاوند سے اپنا گلا کٹوایا تھا۔ پھر راجہ کو خواب میں کہا کہ تیری چھ نسل تک مرد اولاد نہ ہو گی۔ ساتویں میں ہو گی جب کوئی مرد حق قدم رکھے گا۔ چنانچہ اس وقت ہوا جب بابا فرید پیدا ہوئے۔ آپ کے والد راجہ کے یہاں ملازم تھے۔

گیارہ سال کی عمر سے ہی بابا فرید مستغرق رہا کرتے تھے۔ ۲۴ء میں جب ایک کٹیا ڈال کر حضور باباصاحب نے میٹے پر مستقل قیام فرمایا تو یہ آپ کے پاس آنے جانے لگے اور تھوڑے عرصہ بعد گھر ترک کر کے خادموں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ یہ بہت محنتی اور

تھم گو تھے۔ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لانا اور بابا صاحب کے غسل
کے لئے پانی گرم کرنا آپ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اور تقریباً ۱۲
سال اسی خدمت پر رہے۔ یہ زمانہ غربت و تنگی اور خطرات کا
تھا۔ صبر و رضا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھٹی میں پڑا ہے۔
چونکہ آپ اور خادموں سے زیادہ بات چیت نہ کیا کرتے تھے اور
کبھی بھی بغیر بلائے ہوئے لنگر خانے سے جا کر کھانا نہیں مانگتے
تھے اس لئے جان بوجھ کر خادم ان کو بار بار فراموش کر دیتے
تھے لیکن کبھی آپ کے چہرہ سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آپ کو
کئی دن سے کھانا نہیں ملا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ستانے
کے لئے کتوں سے بچا ہوا جھوٹا آپ کے سامنے رکھ دیتے آپ
بخوشی اسی کو کھا لیتے۔ مزاج میں انتہائی تحمّل اور یکسوئی ہمیشہ سے
تھی اور جب ان صفات کو ایک رُخ مل گیا تو پھر کیا تھا۔ ممکن ہے
ان ہی وجوہات کی بنا پر آپ کا نام بدل کر بابا صاحب نے فرید مثال
رکھا۔ غالباً مزاج کے اس تحمّل و سکون کی وجہ ہی سے آپ کے پورے
زمانۂ خدمت میں یا اس کے بعد کبھی بھی ایک جذب کی پھریری
تک کسی نے نہ دیکھی۔ جب آپ کی تعلیم مکمل ہو چکی اور آپ کو تیار
کر دیا گیا تو بابا صاحب سے ایک خرقہ عنایت ہوا اور حکم ملا کہ

تم مچھلی بندر (یعنی مسولی پٹم) جو وجے نگرم سے تین سو میل کے فاصلہ پر ہے) چلے جاؤ۔ قیام کی جگہ بشارت کے ذریعہ بتادی جائے گی۔ آپ کو ریل کا ٹکٹ دے کر گاڑی میں سوار کرادیا گیا۔ آپ تن تنہا وہاں پہنچے۔ راستہ ہی میں اس جگہ کا جہاں آپ کو قیام کرنا تھا، منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ اور نقشہ دماغ میں جم گیا۔ آپ مچھلی بندر پہنچ کر اس جگہ کی تلاش میں گھومتے رہے۔ وہ جگہ کہیں آبادی سے بہت دور تھی۔ شام کے وقت تھک کر شہر کے باہر ایک پلیا پر بیٹھ گئے۔ آدھی رات کے قریب ایک پولیس والے نے کوئی آوارہ سمجھ کر آپ کو حوالات میں بند کر دیا۔ صبح کو جب دیوان جی تفتیش کے لئے آئے تو انہوں نے آپ کو پہچان لیا کہ وجے نگرم دربار کے خادم ہیں۔ تقریباً چوبیس گھنٹے کے بھوکے پیاسے تھے۔ دیوان جی نے خوب خاطر کی۔ چائے پلائی اور عزت کے ساتھ روانہ کر دیا۔ آپ پھر اپنی جگہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ پورے تین دن ہو گئے۔ اس دوران میں نل سے پانی ضرور پی لیا کرتے تھے۔ مگر کھانا کون دیتا۔ آپ شہر سے مشرق کی جانب سمندر کے ساحل کے قریب کھیتوں میں سے گذر رہے تھے کہ ایک گوالے نے جس کے کچھ کھیت بھی وہاں تھے، آپ کو دیکھا اور ایک پکی ہوئی

پھوٹ آپ کو دی کہ اسے کھالو۔ آپ نے اسے کھالیا اور آج تک اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی لذیذ غذا میں نے عمر بھر نہیں کھائی اور اس احسان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کھیت کے قریب ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے۔ یہاں پر ایک پرانا مندر بھی ہے۔ اس گاؤں کے گرد ناگ پھنی اور دیگر جنگلی جھاڑیاں بہت تھیں۔ اس مندر کے قریب ایک ذرا سی جگہ میں فرید مستان نے قیام کیا۔ وہی گوالا جو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا آپ کے لئے کبھی کبھی تھوڑے سے اُبلے ہوئے چاول لا دیتا جس پر بسر اوقات ہونے لگی۔

اللہ رے شانِ توکل، نہ یہ معلوم کہ کرنا کیا ہے نہ یہ کہ رزق کہاں سے آئے گا، رہنا کیسے ہوگا۔ مگر جب دیکھا کہ یہ جگہ اس بشارت کی تصدیق ہے تو وہیں بیٹھ رہے۔ پیر کا حکم سب کچھ ہے۔ مگر مریدین سے بھی اس پر آمنا صدقنا کہنے والے کتنے ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فرید مستان لبِ ساحل ٹہل رہے تھے کہ ایک نوجوان کپڑے اتار کر سمندر میں کودنے کا ارادہ کر رہا تھا پہلے تو آپ کو یہ خیال آیا کہ شاید تیرنے کی غرض سے کود رہا ہے مگر دل نہ مانا تو اس کو بلوا کر اس کا سارا ماجرا پوچھا۔ وہ

کوئی پولیس انسپکٹر تھا جو مشکلات میں گھر گیا تھا۔ اور خودکشی کی غرض سے آیا تھا۔ فرید بابا نے اس کے لئے دعا کی اور یہ فرمایا کہ تم واپس جاؤ، تمہاری ساری مشکلات بہت جلد دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس بات کی شہرت ہوئی تو گو یہ مقام شہر سے کوئی دو تین میل دور ہے اور راستہ بہت ہی خراب ہے، یہاں تک کہ بیل گاڑی کا بھی گذر مشکل ہے۔ پھر بھی لوگ آہستہ آہستہ رجوع ہونے شروع ہو گئے۔

آج اسی جگہ نہایت عالی شان مرمریں فرش کا ایک حجرہ بنا ہوا ہے اور دربار لگا ہوا ہے۔ بڑے چھوٹے، غریب امیر، ہر قوم کے لوگ آتے ہیں اور مرادیں پوری ہونے کی دعا لے کر جاتے ہیں۔ بابا فرید مستان نے بالکل اپنے پیر کی سنّت اختیار کی ہے۔ وہی بیٹھنے کا طریقہ، وہی ہر ایک کی داستان میں گہری دلچسپی، وہی یقین اور اطمینان کے ساتھ دُعا اور پیام کامیابی، چہرہ پر وہی متانت اور مسکراہٹ، پیشانی پر وہی فراست اور سکون۔ اللہ اللہ پیر کا کرم اور توجّہ ہو تو عشق بھی کیا چیز ہے۔ عبد کو معبود بنا دیتی ہے۔

کچھ دنوں اور تصوّر مجھے کر لینے دے
رفتہ رفتہ تیری تصویر بنا جاتا ہوں

۴۔ عبد الرحمٰن بابا

آپ دائم باڑی میسور کے رہنے والے تھے۔ اور پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ دائم باڑی وہ جگہ ہے جہاں بہت متموّل تاجر رہتے ہیں اور زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یہ جگہ مولویت کا مرکز ہے اور ایسے شدید قسم کے مولوی یہاں ہیں جو ہر بات پر کفر کا فتویٰ دیدیتے ہیں گویا یہ جگہ خشک ظاہر پرست مولویوں کا اڈہ ہے۔ مگر چاہے کتنا ہی انسان بھاگے اور ظاہر داری کے پردوں سے اپنے دل کی کرید کو ڈھانکنے کی کوشش کرے۔ پھر بھی سسک تو دل میں ہوتی ہی ہے دائم باڑی وجے نگرم سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے یہاں سے کچھ لوگ باباصاحب کا نام سن کر وجے نگرم آئے تھے اور فیضیاب ہوکر لوٹے تھے۔ ان ہی کے ذریعہ عبدالرحمٰن بابا نے ہمارے باباصاحب کا نام سنا اور ان کے دل نے فوراً گواہی دی کہ تیری عمر بھر کی تلاش کا پھل وہیں ملے گا۔ دیوانہ وار آپ وجے نگرم پہنچے اور خدّام میں داخل ہو گئے۔ بڑے جوشیلے نوجوان تھے۔ مصالحہ تیار تھا۔ بھک سے آگ لگ گئی۔ بابا قادر کے دربار میں آپ زیادہ تر جذب کی حالت میں رہنے لگے۔ آپ مدہوش تو نہ تھے۔ مگر انتہائی جوش تھا۔ دو تین سال کا عرصہ گذر جانے کے بعد ایک دفعہ آپ

نے رات کے وقت ایک ہاتھ میں رسّی اور ایک ہاتھ میں چھُرا لیا اور
حجرۂ مبارک کے گرد طواف شروع کیا۔ کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ انہیں
روکا جائے۔ آپ یہ کہتے تھے کہ آج یا تو نہیں یا میں نہیں۔ غالباً ہر دم
کی آگ میں جلتے اور سلگتے رہنے سے عاجز آگئے تھے۔ تابِ صبر باقی
نہ رہی۔ وصل سے ہی یہ آگ بجھ سکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
آپ کے دل نے یہ کہا کہ جب تک جسم کا ناپاک پردہ موجود ہے
حق سے وصل کا امکان نہیں۔ اسی لئے وہ آج اپنی طبیعت کی
شدّت کے میلان کے مطابق یہ طے کر کے آئے تھے کہ اس پردہ کو
چاک کر دیا جائے۔ مگر بھلا پیر کامل ایسے داؤں میں کب آتا ہے
اس کو تو نہ آپ اپنی جان کی رشوت دے سکتے ہیں اور نہ اس کی
جان کی دھمکی۔ وہی ہوتا ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اپنے چاہنے
اور نہ چاہنے کا اس میں دخل نہیں۔ پیر اور مرید کے درمیان خدا
جانے کیا ہوا۔ مگر دیکھنے میں یہ آیا کہ تھوڑی دیر میں رحمان بابا
ٹھنڈے ہو گئے اور آپ کو وطن جانے کا حکم ملا۔ آپ کچھ دن
دائم باڑی میں ٹھہرے۔ وہاں مولویوں سے سخت جنگ رہتی تھی۔
آپ ٹھہرے رند بے باک۔ راز کی بات بغیر تکلف اور تاویل کے
فرما دیا کرتے تھے۔ مولوی لوگ بھلا اس کو کیسے گوارا کرتے۔ ان

ہیں جو سمجھ دار بھی تھے۔ وہ شریعت کے پردہ کی بے حرمتی پر خفا تھے غرض کہ کچھ دنوں ہی میں آپ کی جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر آپ نڈر تھے۔ کچھ عرصہ ڈٹے رہے۔ اس کے بعد میسور تشریف لے گئے وہاں بھی لوگوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کسی الزام میں آپ پر مقدمہ قائم کر کے قید کروا دیا۔ اس زمانہ میں ایک ڈر سوامی نامی نوجوان آپ کا خادم تھا۔ یہ فوج میں سگنل انسٹرکٹر تھا۔ قید سے رہائی کے بعد آپ بہت بیمار ہو گئے یہاں تک کہ بخار کی شدت سے بیہوشی طاری ہونے لگی۔ آپ نے دوستوں سے درخواست کی کہ مجھے وجے نگرم پہنچا دو۔ ایک ٹکٹ آپ کی جیب میں ڈال دیا گیا اور آپ کو گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ آپ تقریباً بیہوشی کی حالت میں مدراس تک پہنچے۔ مدراس میں ریل بدلتی تھی۔ غالباً قلیوں نے رحم کھا کر آپ کو اُٹھا کر وائی زیگ کی گاڑی میں ڈال دیا۔ وائی زگ پہنچے۔ وہاں پھر گاڑی بدلتی تھی۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے اُٹھا کر آپ کو پلیٹ فارم پر ڈال دیا۔ آپ میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ بات کر سکیں۔ وہاں کے کسی باشندے نے آپ کو پہچانا اور ساتھ لے کر آپ کو وجے نگرم پہنچا دیا وجے نگرم میں ایک جھونپڑی میں رہنے کا حکم ہوا۔ آپ کو اب بھی یہی اصرار تھا کہ مجھے اجازت دے دو۔ یہ جسم کا پردہ مجھ پر بھاری ہے

مگر بار بار سمجھا اور منا کر حضور بابا صاحب نے یہی تلقین کی کہ تم صبر کرو صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ ایک دن جب بابا صاحب دیکھنے کے لئے تشریف لائے تو ہاتھ بڑھایا۔ مصافحہ کیا اور جاں بحق ہو گئے۔

آپ کا مزار مبارک اسی دربار کی شمالی سمت بنا ہوا ہے۔ ہر سال بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے اور نیاز ہوتی ہے۔ ہزاروں لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ عاشق جس کو اپنے پیر کے قدموں میں آخری سکون نصیب ہو۔ اور مبارک ہے وہ رُوح جس کی تلاش کو مرشد کے دامن میں آسودگی میسّر ہوئی ہو۔

۵۔ مقبول شہید

یہ ایک نوجوان بیس اکیس سال کی عمر ہوگی۔ بیوہ ماں کے بڑے لڑکے تھے۔ متمول خاندان اور پڑھے لکھے تھے۔ عرق النّساء کے درد کے سلسلہ میں دربار تشریف لائے۔ وہ درد تو اپنی جگہ دردِ عشق میں تبدیل ہو گئے۔ ان کی ایک عزیزہ نے ان کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ "کیا بات ہے مقبول تم تو مانجھے کی دلہن معلوم ہوتے ہو"۔ ایک اور عزیز نے جواب دیا۔ "ابھی کیا ہے۔ جب مہندی لگے

گی تب دیکھنا اور یہ شعر پڑھا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

یہ شعر مقبول صاحب کے دل پر کچھ ایسا لگا کہ رات دن اسی شعر کو گاتے رہتے۔ چند دن کے بعد حکم ہوا کہ تم واپس اپنی والدہ کے پاس چلے جاؤ۔ رات پہنچے، صبح وصال ہو گیا۔ آنکھوں سے تازہ خون جاری تھا جو قبر میں اتارنے کے بعد بھی بند نہ ہوا۔ ایک بزرگ جنہوں نے قبر میں اتارا فرماتے ہیں کہ شہید حق ہے۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گُل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے

۶۔ رحیم خان بابا (تنالی والے)

اکیس سال قبل بابا جان کے دربار میں اپنی مریضہ بیوی کو لے کر آئے تھے۔ پہلے فرید مستان بابا کے پاس پہنچے تھے۔ پھر بابا جان کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ پہلی بار چار ماہ پندرہ دن رہ کر چلے گئے تھے۔ دوبارہ ایک سال بعد اکیس دن کے لئے آئے تھے۔ اس وقت اجازت ملی تھی۔ جا کر تنالی میں قیام کیا اور خدمتِ خلق میں لگے رہے۔ اس کے بعد پانچ دفعہ اور شرفِ حاضری

نصیب ہوا۔ آخری بار حاضری کا یہ نظارہ تھا کہ جب حضور باباجان دربار میں تشریف لائے تو رحیم خاں بابا دربار کے ایک گوشہ میں با ادب کھڑے تھے۔ حضور نے تخت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے اس جانب نظر کی اور فرمایا 'رحیم خاں' تو مرید صادق نے ہاتھ جوڑ لیئے۔ تاب سلام یا تاب قدمبوسی اس فدائے دیدار کو کہاں تھی۔ تبرک لینے کے لیئے بھی لائن سے ہٹ کر اس جگہ جاکر باادب کھڑے ہو گئے جہاں پر جذامی کھڑے ہوتے ہیں۔ حضور کا دست مبارک جب رحیم خاں بابا کی طرف کشادہ ہوا تو رحیم خاں بابا نے دور ہی سے ہاتھ بڑھا کر نہایت ادب کے انداز میں تبرک لیا۔ اور خاموشی سے پیچھے کی جانب آکر دربار میں بیٹھ گئے۔ اس کا یہ صلہ ملا کہ اسی شب رات کے دو بجے قیام گاہ کے پائیں دروازہ سے اندر بلائے گئے اور شرفِ باریابی خاص عنایت ہوا۔

رحیم خاں بابا شدّتِ عشق کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ جب اجازت ملی تھی اس وقت بھی جذبات میں ہیجان و شدّت تھی اور اس آخری بار ۶۰ء میں بھی۔ اگرچہ اوپر سے سکونِ سمندر نظر آتا ہے۔ مگر اندرونِ قلب و روح میں ایک طوفانِ عظیم اٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ قادر نگر میں قیام کرنے کے بعد یہیں پردہ فرمالیا۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جو پیشِ یار ہی پروان چڑھے۔ بچوں میں رحیم خاں بابا ہی وہ پہلے

شہید ہیں جنہیں لال میٹھ کے دامن میں جگہ ملی ۔ لال میٹھ وہ مقامِ مقدس ہے ۔ جس پر خود حضور بابا جان نے ایک سال بعد آرام فرمایا۔ رحیم خاں بابا کا ساتھ دینے کے لئے ان جیسا مزاج رکھنے والے دوسرے شہیدِ حق شکور بابا تھے جو حضور بابا جان کے وصال کے بعد پردہ فرما کر بابا جان کے قدموں میں پہاڑی کے نیچے کے دامن میں رحیم خاں بابا سے جا ملے۔

رحیم خاں بابا کی شدّتِ عشق کا اندازہ ان کے اقوال سے بھی لگایا جا سکتا ہے ۔ فرماتے تھے جو بابا کا رنگ ہے ویسا ہی ہونا ۔ جو کام کرے بابا کا رنگ رہے تو کرے ورنہ نہیں یعنی تخلقوا باخلاق اللہ کی زندہ تصویر بن جانا ۔ جو دیکھا ہے اس کو دل میں بسا لو ۔ اسی کی یاد کرو ۔ یہی مریدی ہے ۔ جب دانہ خاک میں مل جاتا ہے تو گلِ گلزار ہوتا ہے ۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

اسی وقت خدا پورے طور پر انسان میں آسکتا ہے ۔ مرنے سے پہلے مر جانا اگر انسان بننا ہے تو جب اس کا خادم ہو جائے تب ہی مرنا اسی کی یاد میں ۔ اپنی جان اس کے اوپر فدا کرنا (اور حقیقتاً

انہوں نے اپنی جان فدا کر کے دکھا دی تاکہ حضور ابھی درمیان سے رخصت نہ ہوں ۔ اس زمانہ سے بہت قبل ہی حضور بابا جان نے فرمانا شروع کر دیا تھا۔ کہ اب ہم جاتے ہیں ۔ ہمارا کام ختم ہو گیا) رحیم خاں بابا فرماتے تھے اپنی جان ہاتھ میں لے کر پھرنا۔ ذکر کرتے ہوئے رہنا۔ تو کسی نہ کسی کی زبان سے وہ سکھاتا ہی رہتا ہے ۔ بابا جان اپنی طرف بلا کر یوں نہیں دیتے کہ کسی کو دُکھ کے راستہ پر کیوں ڈالنا' جب تک اس کی خود خواہش نہ ہو۔ خدا بھی راستہ پر نہیں ڈالتا ۔ کنزاً مخفیاً انا الحق کا راز کُھل جاتا ہے۔ ہر بندے کو راستہ میں کیسے ڈالا جا سکتا ہے ۔ مولویوں سے ہم جھگڑا نہیں کرتے بس کنارہ کر لیتے ہیں۔ روشنی کی بات ایسی ہے کہ ذکر کرتے ہوئے بڑھ جاتی ہے۔ اس راستہ میں بس 'میں' اور 'تُو' ہے ۔ جب راستہ پر ڈالدیا تو ساتھ ہی ہوتا ہے ۔ پیٹھ کے پیچھے ۔ بابا جان کا کہا ہوا شعر دہراتے تھے ۔

کنتُ کنزاً مخفیاً بے نشاں تو ہی تو ہے
حبِّ ذاتی سے عیاں سرِّ نہاں تو ہی تو ہے

اور فرماتے ہیں ۔ بابا جان کا ارشاد ہے ۔ دو ہیں تو میرا ۔ تین ہیں تو تیرا ۔ اس لئے اس راستہ میں بس 'مَیں' اور 'تُو' ہے اور یہ کہ 'مَیں'

"تو ہوا تو میں ہوا۔ ایسی محبت رکھنا دل میں۔ یہ حالت ہو جائے تو ہر ایک میں تو سمایا۔ اور جب تخلقو باخلاق اللہ ہو جائے۔ جب صبغۃ اللہ کا رنگ چڑھ جائے تو پھر بابا جان سے کہو۔

تم کہو لا الٰہ الا اللہ ہولی کھیلونگی میں کہکر بسم اللہ
الست کی بنی پچکاری الا اللہ کا ہار گندھا
ایسا پیا میرا، ایسا سیّاں میرا پیّاں پڑونگی میں پیّاں پڑونگی

اور الا اللہ کی ہولی کھیل کر بالآخر رحیم خاں بابا حضور کے قدموں میں ہمیشہ کے لئے جا پڑے۔ دائمی حضوری اور دائمی وصال ظاہر و باطن کی ابد الاباد زندگی میں۔

۷۔ شکور بابا (اسحٰق پٹنم والے)

مجاور شکور کہلاتے تھے۔ کیونکہ آخری دور میں حجرۂ مبارک کی چابیاں ان کے پاس تھیں۔ چابیوں کی سپردگی سے قبل کا ایک واقعہ وہ بتاتے ہیں کہ رات اشارہ ہوا اور اُٹھ کر حجرۂ مبارک کی طرف چلے۔ دیکھا کہ پٹ کھُلے ہوئے ہیں۔ حجرہ مبارک روشن ہے اور در کے آگے ایک شیر ببر لیٹا ہوا ہے۔ جب یہ کچھ اور آگے بڑھے کہ اس کو پھاند کر اندر چلے جائیں تو شیر نے غرّاتے ہوئے بھاری آواز سے یوں کہا کہ اے چنڈال تیری اتنی جرائت۔ اس

کے بعد اس چنڈال جسم کے فنا کرنے کے لئے جس بھٹی میں، جس آگ میں انہوں نے جلایا اور یہ جلتے رہے، ان کی آنکھیں گواہی دیتی تھیں آنکھیں کیا تھیں دو شمعیں فروزاں تھیں۔ رونے رلانے کے دن تو پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ ہجر میں دل کی آگ تو ایک کوہ آتش فشاں ہوتی ہے مگر خدا جانے یہ کون سی آگ ہوتی ہے جو آنکھوں میں جلتی ہے۔ لوگ تو کعبۃ اللہ کے غلاف کو چوم کر ہی مطمئن چلے آتے ہیں مگر درونِ کعبہ کس کی رسائی ہوتی ہے۔

شکور بابا کے احوال یوں ہیں کہ احمق پٹنم کے ایک شریف گھرانے کے فرد تھے۔ کچھ دن تک تو کمپاؤنڈری کرتے رہے۔ مگر دل میں جو ایک نامعلوم کیڑا اکثر تار ہتا تھا وہ بھلا چین سے کب بیٹھنے دیتا۔ وظائف اور عملیات کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں بھی صرف بھانامتی کے تماشے ہی دیکھتے رہے۔ بیزار ہو کر چھوڑ چھاڑ دیا۔ پھر عشق نے کنڈی کھٹکھٹائی اور اپنی ہی ایک عزیزہ منظورِ نظر ہوئی۔ مگر جن کی قسمت میں کچھ اور ہوتا ہے بھلا ان کو قیام کہاں نصیب۔ وہ دوشیزہ منظورِ الٰہی ہو گئی۔ اور ان میں ہجر کی آگ شدت سے بھڑک اٹھی۔

بشارت میں ایک اور لڑکی دکھائی گئی جس کی صورت بعینہٖ

ویسی ہی تھی۔ اس سے شادی کی۔ مگر اس آگ کو کون ٹھنڈا کرے۔ نہ چین نہ قرار۔ ایک دن یہ طے کر کے کہ اس جسم کے جنجال سے چھوٹوں، خودکشی کا ارادہ کیا۔ اور پرچہ لکھ کر تکیہ کے نیچے چھوڑ کر خود چلے۔ راستہ میں کلنگ پٹنم کی مسجد میں رات بسیرا کیا۔ بابا جان کا ادھر دورہ ہوا۔ ایک خادم کو نشانی بتا کر بھیجا کہ اس رنگ و روپ کا ایک آدمی فلاں مسجد میں ہے اس کو بلا لاؤ۔ حاضر ہوئے اور ان ہی کے ہو کر رہ گئے۔

تقریباً پندرہ سال تک خدمت میں رہے ہمیشہ بیمار رہتے تھے اور شاکر رہتے تھے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ کوئی خصوصی مہمان جب خاص ملاقات کے بعد واپس آتے اور ان سے ملتے تو یہ بھی تقریباً وہی باتیں بتاتے جو بابا جان کا حکم ہوتا تھا۔ ہلدی، مرچ اور تیل کا ذکر کسی اور جگہ آچکا ہے۔ ہلدی کی بُو سے انہیں الجھن ہوتی تھی مگر تیل اور سرخ مرچ کی منتہا کی اگر کسی کو تلاش ہو تو ان میں پائی جاتی تھی۔ یہ تیل وہ تیل ہے جو زیتون مبارک کا نچوڑ ہے۔ اور جس سے طاق کا قندیل جلتا رہتا ہے۔ اور یہ سرخ مرچیں وہ جوشِ عشق ہے جس کے تاروں سے بندھے پروانے طواف کرتے ہیں اور اپنی جان، جانِ اولین میں ضم کر دیتے ہیں۔

باباجان کی خدمت میں کھانا کھلانا ان کے سپرد تھا۔ جس شفقت و محبّت سے یہ کھانا کھلاتے تھے کوئی ماں کا دل ہی جانتا ہوگا جو اپنے بچّے کو کھلاتی ہو۔ یا کوئی پردہ دار بیوی جو اپنے مالک کو کھلاتی ہو۔ بڑے سخی تھے اور دردمند۔ باباجان نے وصال سے دوچار سال پہلے ہی ارشاد فرمایا تھا کہ تم جاؤ اور فلاں جگہ بیٹھو مگر ان کو کسی قیمت بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ کوئی اپنا دربار جانا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ جب شمسِ حقیقت نصف النّہار پر ہو تو کیا کوئی اپنا دیا لئے گھومتا پھرے۔ بڑی شرم کی بات ہوتی ہے۔

باباجان کے وصال کے بعد مجبوراً ان کو کچھ عرصہ کے لئے دربار چھوڑنا پڑا مگر کب تک۔ ازلی کشش کھینچ لائی اور جہاں کا خمیر تھا اسی خاک میں سپردِ خاک ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

میرے دل میں سما گئے ہیں آپ — اپنے گھر آج آ گئے ہیں آپ
زندگی تھی مری شبِ تاریک — ماہِ تاباں دکھا گئے ہیں آپ
چھوڑیئے اب یہ سب گلے شکوے — میرا مطلب تو پا گئے ہیں آپ
چونک اٹھتا ہوں نیند میں اکثر — کیسے فتنے جگا گئے ہیں آپ
چاند تاروں میں ڈھونڈتا ہوں میں — کیا ٹھکانا بتا گئے ہیں آپ
رات بھادوں ہے دن کو ساون ہے — بدلیاں بن کے چھا گئے ہیں آپ
دل پہ طاری ہے وجد کا عالم — کیسے نغمے سنا گئے ہیں آپ
فکرِ امروز نے غمِ فردا — نقش ایسا جما گئے ہیں آپ
بھول بیٹھا تھا راستہ دل کا — مجھ کو مجھ سے ملا گئے ہیں آپ

یادِ قادر میں مست رہتا ہوں
جام کیسا پلا گئے ہیں آپ

(رحمٰن بابا)

پیام

باب ۱۸

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

(اقبال)

"میں کون ہوں۔ کس لئے آیا اور کیا کر کے جانا ہے؟" یہ تین سوال ایسے ہیں جنہیں ہر اس فرد نے جو محض جانور نہ ہو، اس زندگی میں کسی نہ کسی موقع پر اپنے دل سے ضرور پوچھا ہوگا۔ اس کا جواب کون دے۔ دل ہی دے سکتا ہے۔ یا دل کو اگر خدا کا گھر یعنی حق کا مرکز بنالے تو پھر حق خود جواب دے سکتا ہے۔ یہ کسی عالم یا دانشمند کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر دل کی زبان اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ علم لدنی ہے اور اس کو سفید و سیاہ کا پابند کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف اشارات اور کنایات کے ذریعہ سمجھ دار لوگوں کے لئے کچھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

حق جب زمان و مکان سے بہت ماورا ہے تو وہ خیال میں کیسے سما سکتا ہے۔ صرف حال میں اس کا احساس ہو سکتا ہے۔ یعنی اس

جس کی مضبوطی کے باعث جب کوئی ماسوا کو فراموش کر کے اسی کا ہو جائے اور اس کا کرم بھی اس کے شاملِ حال ہو تب البتہ وہ اس کو پا سکتا ہے۔ آپ روشنی کو نہیں دیکھ سکتے مگر روشنی میں چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح آپ حق کو نہیں سمجھ سکتے۔ مگر کسی ایسی شخصیت کو جس نے حق کو پا لیا ہے سمجھنے کی کوشش کریں اور اس تک پہنچنے کی سعی فرمائیں تو پھر دل حق کو بھی سمجھ سکتا ہے اور حق کو اپنے اندر بھی سما لیتا ہے۔

اوراقِ بالا میں ایک ایسی شخصیت بابا قادر اولیا کی زندگی کے چند پہلوؤں پر ایک بے ربط نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بے ربط یوں ہے کہ حق محیط ہے۔ جدھر سے جھانکو ایک نیا روپ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا تعین ناممکن ہے اِلّا کسی مردِ مومن کی ذات میں۔ اور کسی ذات میں رسائی بہت ہی دشوار ہے۔ اپنے آپ تک تو رسائی ہو نہیں پاتی۔ صفات اپنی جگہ قابلِ تحسین ہوں مگر ذات ان سے ماورا ہے۔ صرف عشق کے ذریعہ دل میں یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ تو ہی تو ہے۔ اس سے آگے ذات کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اکثر سمجھدار لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ فقیر کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ اس کا "مشن" کیا ہوتا ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک

ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اور ایک باطن سے۔ جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے، یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ فقیر کا مقصدِ حیات "شخصیت کی تعمیر" ہے ارتقاءِ زندگی میں باطنی صلاحیتوں کو جلا دے کر ان کی نشو و نما کرنے میں مشیت کا ہاتھ بٹانا یہ فقیر کا کام ہے۔ خدا کے ہاتھ کوئی اور نہیں ہوتے۔ فقیر کے ہاتھ ہی خدا کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ خدا کی زبان کوئی اور نہیں ہوتی۔ آئینہ دار دل سے جو بات نکلتی ہے وہی مولائے کائنات کا حکم ہوتا ہے۔

تعمیرِ شخصیت کے لئے عملی اداروں نے، سماج نے، اخلاقی فلسفہ نے، مصلحینِ دین نے، مدبرینِ معاشرہ نے جو جو نصاب قائم کئے ہیں۔ اور جس طرزِ عمل کی سفارش کی ہے اسی پر نسلِ انسانی اپنے اونچ نیچ کو لئے ہوئے، اپنے فروغ اور نیست کو لئے ہوئے صدیوں چلتی رہی ہے۔ اس کی کہانی تو تاریخ کے صفحوں میں موجود ہے فقیر سمجھ کے ذریعہ دل تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ دل کے ذریعہ سمجھ تک بات کو پہنچاتا ہے۔ اور دل ہی کسی کے کردار میں کوئی انقلاب یا تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ محض ذہنی اعتبار سے کبھی بھی آپ کسی کو کسی بات پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ مگر جو بات ایک دفعہ دل میں سما جائے اس کی اسباب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا

کرنے کے لئے دماغ خود بخود ہزار حیلے یا صحیح اسباب ڈھونڈ لیتا ہے فقیر محبّت کی فضا میں دلوں کو اپناتا ہے سختی سے نہیں، ڈرا کر نہیں بلکہ محبّت سے وہ جو ہلکا سا اشارہ کرتا ہے وہی افراد کی زندگی کا نصب العین بن جاتا ہے اور کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے سے بڑے کثیف باطن، خود غرض اور ظالم لوگ باباصاحب کے دربار میں پہنچنے کے بعد فرشتہ صفت اور خلق پر ایک احسان بن جاتے ہیں۔ تعمیر شخصیّت یہی نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ تو سب کچھ عالم اسباب کی باتیں ہیں۔ ایک اور عالم بھی ہوتا ہے جو عالم امر کہلاتا ہے۔ جس میں روح اس طرح کارفرما ہوتی ہے جس طرح عالمِ اسباب میں نفس کارفرما ہوتا ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، یہاں جو کچھ گزرتا ہے اس کا اصلی محرک اس دنیا کا پابند نہیں۔ بلکہ پہلے عالم امر میں اس کی تشکیل ہوتی ہے۔ لطیفۂ قلب سے عالمِ مثال میں اس کے نقشے نظر آتے ہیں اور عالمِ اسباب میں آکر یہ ظاہری وجود اختیار کر لیتا ہے۔ آپ خود سوچیئے یہ تاریخ کا لوٹ پھیر کسی فرد کی زندگی کی روش کیا اپنے ہاتھوں میں ہے۔ کیا یہ روش کسی فرد یا جماعت کے فیصلہ سے ہو سکتی ہے۔ اس بات کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ قسمت کیا



مرکزِ آمر

چیز ہے، لوحِ محفوظ پر کیا لکھا ہے۔ یہ سب عالمِ امر کی باتیں ہیں۔ فقیر جب کسی نظارہ میں ایک مینار کی طرح نمایاں ہوتا ہے تو مرکزِ امر بن جاتا ہے۔ اس کو صرف افراد ہی نہیں، اقوام ہی نہیں۔ بلکہ انسانیت کی تعمیر میں دخل ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں اکثر انس کا ذکر آتا ہے۔ وہاں جن کا بھی ذکر آیا ہے۔ کوئی مفسّر بھی اس جن کے لفظ پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتا۔ صرف یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ بھی خدا کی ایک مخلوق ہے۔ ان کا بھی ایک عالم ہے۔ فقراء کے یہاں یہ بات مسلّم ہے کہ جس طرح جمادات کا ایک عالم ہے، حیوانات اور انسانوں کا ایک عالم ہے۔ اسی طرح خالق نے اٹھارہ ہزار عالم کی تخلیق کی ہے۔ واللہ اعلم۔ فقراء کی کاوشوں کا میدان کتنے عالموں میں ہوتا ہے۔ کیا کیا ہوتا ہے۔ اور کس کس طرح ہوتا ہے کون بتائے۔

دوہہ

میری کٹیا شام براجے ٹپ ٹپ نیر بہاؤں
جھوم جھوم کے گاؤں من میں نین دیپ جلاؤں
انگ انگ سے روم روم سے شام شام چلاؤں
روتے گاتے گاتے گاتے میں پگلا بن جاؤں

(رحمان بابا)

یوں ہی عمر گنوائیو بندے
اپنا بھید نہ پایو بندے
چھوڑ دے دنیا کے دھندے
اپنے گھر کو بسایو بندے

پستک پڑھ پڑھ جیون بیتا گورو سیس نوایو بندے
متھرا کے چکر بھی کاٹے کعبے بھی ہو آیو بندے
دھرتی کے کونے کونے میں بھگتی ڈھنگ رچایو بندے

یوں ہی عمر گنوایو بندے
اپنا بھید نہ پایو بندے

چھوڑ دے دنیا کے دھندے

اپنے گھر کو بسالیو بندے

شانتی شانتی سمرن کر کے　　من بے چین بنالیو بندے

آنسوؤں کی مالا کبھی جپ لی　　جیون روگ لگالیو بندے

گھاٹے کے سودے میں پڑ کر　　من کی پونجی لٹالیو بندے

یوں ہی عمر گنوالیو بندے

اپنا بھید نہ پالیو بندے

چھوڑ دے دنیا کے دھندے

اپنے گھر کو بسالیو بندے

تن کا من سے میل ملالے　　تن ہی من کی کالیو بندے

یہ مسجد یہ مندر مٹھ ہے　　اس میں روپ سمالیو بندے

اُتم شکتی ہے من تیرا　　قادر جی فرمالیو بندے

یوں ہی عمر گنوالیو بندے

اپنا بھید نہ پالیو بندے

چھوڑ دے دنیا کے دھندے

اپنے گھر کو بسالیو بندے

(رحمان بابا)

پِلا پِلا کہ یہی شورِ عام ہے ساقی — گرا گرا کہ تجھے اذنِ عام ہے ساقی
یہ دَور ایسا چلے خاص و عام ہوں مدہوش — کہ اب تو رقص میں سارا نظام ہے ساقی
ہوئی ہے گردشِ مینا جو لطفِ جاناں سے — سرورِ وجد میں مٹی کا جام ہے ساقی
کمالِ شوق ہی لایا ہے دار پر آخر — اسیرِ زُلف کا یہی مقام ہے ساقی
لکھا ہے خون کے قطروں سے اشہد اللہ — ہوا جو وردِ زباں تیرا نام ہے ساقی
ٹپک رہا ہے لہو نوکِ ہر رگِ جاں سے — جنونِ شوق کی رنگیں شام ہے ساقی
ہر ایک تارِ رگِ جان ہے تجھ سے وابستہ — ہر ایک سانس درود و سلام ہے ساقی

(وِداعیہ)

ارتقاء باطن — باب ۱۹

یا کرامی اذبحو ھذا البقر　　ان اردتم حشر ارواح النظر
اے مہربانو اس گائے کو ذبح کرو　　اگر تم چاہتے ہو کہ نظر کی روحیں اکٹھی ہو جائیں

از جمادی مردم و نامی شدم　　ور نما مردم بہ حیواں سر زدم
جمادی حالت سے مرا تو نامی ہو گیا　　نامی سے مرا تو حیوان ہو گیا

مردم از حیوانی و آدم شدم　　پس چہ ترسم کے زمردم کم شوم
حیوانی سے مرا تو آدمی ہو گیا　　پھر کیا ڈروں کہ موت سے گھٹ جاؤنگا

حملۂ دیگر بمیرم از بشر　　تا برآرم از ملائک بال و پر
ایک دفعہ پھر بشر سے مروں تو　　فرشتوں کے بازو اور پر نکال لوں گا

از ملک ہم باید جستن زجو　　کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ
فرشتوں سے بھی (آگے) جست جو چاہیے　　ہر شے ہلاک ہونیوالی ہے مگر اسکی ذات

بارِ دیگر از ملک قرباں شوم　　آنچہ اندر وہم ناید آں شوم
پھر ایک بار فرشتہ سے قرباں ہو جاؤں　　وہ ہو جاؤں جو وہم میں نہ آسکے

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں　　گویدم کانا الیہ راجعون
پھر عدم ہو جاؤں ارغنوں کی آواز کی طرح　　مجھے کہتا ہے ہم اس کی طرف رجوع کرنیوالے ہیں

(رومی)

ہندو اور بدھ مذاہب کا یہ بہت ہی قدیم عقیدہ ہے کہ آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کی روح جس حال میں ہو اسی قسم کا ایک جسم تلاش کر کے اس میں داخل ہو جاتی ہے اور ہر آدمی کے اعمال یا قسمت اس پچھلی روح کے کردار سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کو مسئلہ "آواگون" کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایک نہایت ہی دلچسپ مسئلہ ہے۔ اور یورپ کے بعض بڑے بڑے مفکرین بھی اس کے قائل ہیں کیونکہ یہ مسئلہ مقصدِ حیات کی بہت سی پیچیدگیوں کو ذہنی اعتبار سے حل کر دیتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا رومیؒ کے مندرجہ بالا اشعار کی طرف اکثر فقرا اشارہ کرتے آئے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ بظاہر ارکان اسلام کے خلاف ہے اس لئے وہ اس میں قدم بڑھانے سے جھجکتے ہیں۔ گو درحقیقت اس میں کوئی غیر اسلامی بات نہیں ہے۔

ہم اکثر کتابوں میں اس قسم کے واقعات پڑھتے آئے ہیں۔ مثلاً حضرت رابعہ بصری نے کسی آدمی سے یہ فرمائش کی کہ ایک انسان سے تھوڑا سا تیل خرید کر لادو۔ خادم نے سوال کیا کہ سب ہی انسان ہیں۔ میں کس سے خرید کر لا دوں۔ تو حضرت رابعہ بصری نے اپنے سر کا بال دیا اور کہا کہ اس کا حلقہ بنا کر اس میں سے دیکھو اور

جو انسان نظر آئے اس سے خرید لو۔ خادم بازار کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی کا سر گیدڑ کا ہے، کسی کا کتّے کا، کسی کا کوّے کا یا گِدھ کا اور جسم بھی اسی طرح مختلف جانوروں کے ہیں۔ کچھ حصّہ انسانی باقی جانور۔ آخر ایک شخص ایسا نظر آیا جو پورا انسان دکھائی دیا۔ خادم اس سے تیل خرید کر لے گیا۔

دن بھر کی مشغولیتوں سے فارغ ہو کر اور بابا صاحب سے رخصت لے کر خدّام رات کے گیارہ بارہ بجے کبھی کبھی سماع خانہ میں بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ موضوعِ کلام تقدیر اور تدبیر تھا۔ ایک خادم نے یہ قصہ سنایا۔

کسی بادشاہ کے پاس ایک ملازم رہتا تھا۔ بیس سال کی طویل مدّت دربانی کرتے ہوئے گزر گئی۔ ایک دن بادشاہ شکار پر گیا اور ایک ہرن کا پیچھا کرتے کرتے اپنی نشست گاہ سے اکیلا بہت دور نکل گیا۔ دوپہر کا وقت تھا ستانے کے لئے ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی نشست گاہ پہنچ۔ وہاں پہنچنے پر دیکھا کہ اپنی بیش قیمت اور عزیز تلوار اسی درخت کے نیچے بھول آیا ہے۔ فوراً دربان کو بلایا اور نشانی بتا کر کہا کہ فوراً جاؤ

اور تلوار واپس لے آؤ۔ دربان وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ بادشاہ کی تلوار تو زمین پر رکھی ہوئی ہے اور بالکل بادشاہ کی شکل کا ایک شخص ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر پہرہ دے رہا ہے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو۔؟ اس شخص نے جواب دیا کہ میں بادشاہ کی قسمت ہوں۔ اور اس کی تلوار کی حفاظت کر رہی ہوں۔ دربان نے کہا کہ میں بادشاہ کا بھیجا ہوا ہوں اور تلوار لینے آیا ہوں۔ قسمت نے اجازت دی کہ تلوار اٹھا لو۔ دربان جب چلنے لگا تو اس کو خیال آیا کہ یہ تو پوچھوں کہ آخر میری قسمت کہاں ہے۔ ہمت کر کے اس نے سوال کیا تو اس شخص نے جواب دیا کہ تم جس راستہ سے آئے ہو بجائے اس راستہ کے یہ جو پہاڑیوں کے دامن سے راستہ گزرتا ہے اس سے لوٹو وہاں ایک غار ملے گا اور اس میں تمہاری ہی شکل کا ایک شخص سوتا ہوا پاؤ گے۔ اس کو ایک لات مار کر جگا دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یہ غار میں پہنچا تو بالکل اپنی ہی شکل کے ایک شخص کو سوتا ہوا پایا۔ دربان نے یہ کہہ کر کہ ارے کم بخت تجھے سوتے ہوئے بیس سال ہو گئے۔ نہ مجھ کو کوئی ترقی اور نہ ہی کسی قسم کی مراعات۔ اٹھ! کہہ کر ایک لات ماری۔ وہ اٹھ گیا اور کہا کہ جیتے جی اب کبھی نہ سوؤں گا۔ تم جاؤ۔ یہ خوش خوش لوٹ

رہا تھا کہ دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ نہ معلوم بادشاہ سلامت کیا سزا دیں گے۔ لمبا راستہ اختیار کر کے میں نے بڑی دیر لگا دی۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے روبرو حاضر ہو کر تلوار پیش کی۔ بادشاہ اپنی گرانقدر تلوار کو پا کر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ دربان کو فوراً جمعدار بنا دیا جائے۔ یہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا واہ ری قسمت۔ کچھ دن گزرے ہوں گے کہ سالانہ دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ سلامت تخت پر تھے۔ دائیں بائیں دالان میں صف درصف، رؤسا اور حکام۔ اور جمعدار صاحب دروازہ پر کھڑے تھے۔ تخت کے پاس ثنا خوانی ہو رہی تھی۔ اس کو خیال آیا کہ اگر سچ مچ میری قسمت جاگی ہوئی ہے تو اگر الٹا بھی کام کروں گا تو وہ بھی سیدھا ہو جائے گا۔ اس جاہل نے اپنا جوتا نکال کر سیدھا ایسا نشانہ لگایا کہ تاج پر لگا اور تاج سر سے زمین پر گر پڑا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ مگر فوراً ہی ایک ذاتی محافظ نے دیکھا کہ تاج میں ایک بالشت بھر کا سفید سانپ جو نہایت زہریلا ہوتا ہے بیٹھا ہوا ہے۔ اس سانپ کو فوراً مار ڈالا گیا۔ جمعدار کی اس حرکت کو جس محافظ نے دیکھا تھا اس نے جمعدار کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ تخت سے نیچے اُترا۔

اور جمعدار کو گلے سے لگا کر یہ کہا کہ تم میرے سچے دوست ہو۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔ آج سے تم میرے وزیر ہو۔ وزیر صاحب مسکرا رہے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے ۔ واہ ری قسمت، کچھ عرصہ گزرا اور وزیر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ انفرادی حیثیت سے تو اُلٹے کام کر کے دیکھ لیے۔ اب ذرا رعایا پر بھی کوئی اُلٹا عمل کروں اور اگر وہ پھر بھی سیدھا بیٹھے، تو بات ہے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا اور شہر کے ایک ہی تالاب میں بس اتنا پانی تھا کہ بارش کے ہونے تک پینے کے لئے کافی ہو اور بارش کے ہونے میں ابھی ایک ماہ کی دیر تھی۔ وزیر صاحب نے حکم دیا کہ تالاب کے بند کھول دو اور سارا پانی بہا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خلقت نے واویلا مچایا اور جا کر بادشاہ سے شکایت کی۔ مگر بادشاہ نے یہی جواب دیا کہ میرا وزیر بہت دانا ہے وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ اگلے ہی دن اتنی بارش ہوئی کہ تالاب پُر ہو گیا اور اگر بند نہ کھول دئے جاتے تو تالاب کے ٹوٹ کر شہر کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ بادشاہ وزیر کی اس دانائی سے اتنا خوش ہوا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اس سے کر دی اور سلطنت

اس کے سپرد کر کے خود مستعفی ہو گیا۔ ہمارے بادشاہ سلامت دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے کہ واہ ری قسمت!

یہ تو ایک قصّہ ہے مگر ایک بڑی اہم بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کو ہم قسمت کہتے ہیں وہ اپنے باطن کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ظاہر اور باطن کے درمیان ایک آہنی دیوار ہے اور اس دیوار کو پار کرنا یقینی اپنے باطن تک پہنچنے اور اس کی اصلاح کرنے کا راستہ فقیر خوب جانتا ہے۔ صوفیائے کرام کا کہنا ہے کہ آہنی دیوار قلب اور روح کے درمیان ہوتی ہے اور اس کو پار کرنے کا راستہ ہے صرف مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (مر جاؤ مرنے سے پہلے) یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ حق ہے کہ اس میدان میں سر کٹانے سے پہلے تو کوئی قدم رکھ ہی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ ایک خادم نے آپ سے عرض کی کہ حضور میں یہ دیکھتا ہوں کہ بظاہر فاسق و فاجر لوگوں کو بھی بغیر کسی محنت و ریاضت کے دولتِ سرمدی عطا ہوتی ہے اور برعکس اس کے صحیح النّسب سادات جو بچپن سے عبادتیں بھی کرتے رہتے ہیں اور عملِ صالح بھی، خالی کے خالی رہ جاتے ہیں۔ حضور نے پہلے تو یہ فرمایا کہ یہ صلاحیت اور استعداد خون میں ہونی چاہیئے مگر خادم کو تشفّی نہ ہوتی۔ پھر ایک اور موقعہ پر جب ایک خادم نے ایک

بہت اچھے شخص کی جو سادات سے تھے سفارش کی تو بابا صاحب نے کچھ رابعہ بصری والا ہی منظر دکھلایا۔ خادم نے دیکھا کہ وہ سیّد زادے دراصل ایک داڑھی والے بکرے کی شکل میں ہیں تب یہ سمجھ میں آیا کہ باطن ظاہر سے علیحدہ ہے۔ یہ ایک ٹھوس اور پائدار چیز ہے اور بزرگانِ دین اسی باطن کو دیکھ کر یہ دولتِ فقر عطا فرماتے ہیں۔ ظاہر کا باطن سے کتنا تعلق ہے۔ اعمال چاہے وہ صالح ہوں یا بد، ان کا باطن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بھید تب ہی معلوم ہوتے ہیں کہ باطن کا راستہ کھل جاتے۔ عوام کے لئے یہ راستہ صرف موت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اہلِ شریعت وطریقت کو بھی یہ راستہ جسمانی موت سے پہلے نصیب نہیں ہوتا۔ مگر اہلِ طریقت ومعرفت کے نزدیک اس میدان میں انسان اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب وہ موت کے دروازہ کو زندگی ہی میں پار کرلے۔ یعنی موتو قبل ان تموتو کی راہ سے۔ یہ ہے کلمہ لاالٰہ الا اللّٰہ کا راز۔ یہی ہے فنا اور بقا۔ اور یہی ہے نفی اور اثبات۔

سائنس بتاتی ہے کہ زندگی جو درحقیقت رُوحِ ازلی ہے کن کن ارتقائی مقامات سے گزر کر انسانی جسم تک پہنچتی ہے۔ سائنس کے حساب سے اِس کاوشِ فطرت کو تیس کروڑ سال لگے ہیں۔ سائنس یہ بھی

بتاتی ہے کہ بطنِ مادر میں جب نطفہ جسم اختیار کرتا ہے تو حمل کے پہلے تین مہینوں میں یہ تیئس کروڑ سال کی منزلیں جسمانی اعتبار سے طے کر لیتا ہے مثلاً یہ جسم مچھلی، چھپکلی وغیرہ وغیرہ کی شکلیں اختیار کرتا ہوا اور ان سے گزرتا ہوا انسان کی شکل میں آکر قیام پاتا ہے۔ گویا اس طرح ارتقاء جسمانی وجود میں آتا ہے۔ سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کے ذہن کا ارتقاء اور اس کا نفسیاتی ارتقاء مقامِ جسم کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے مثلاً ایسے بوڑھے لوگ ملیں گے جن کا ذہنی ارتقاء بچوں جیسا ہوتا ہے۔ اور ایسے بچے بھی ملیں گے جن کی سنجیدگی بوڑھوں کو مات کرتی ہے۔ یہی حال نفسیاتی مقامات کا بھی ہوتا ہے۔

ان مشاہدوں سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ انسان کی ساری صلاحیتیں ایک ساتھ اور قدم بقدم ترقی اور ارتقاء کی منزلیں طے کرتی جائیں۔ مثلاً یورپ کا دماغی ارتقاء کمال تک پہنچ گیا ہے۔ مگر نفسیاتی اعتبار سے غالباً وہ جانوروں کی منزل سے آگے نہیں نکلا۔ اور روحانی ارتقاء کا تو ذکر ہی کیا۔ ہندوؤں کا مسئلہ آواگون اگر ہم باطن کی طرف منسوب کر کے سوچیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی بات اسلامی عقائد کے خلاف بھی نہیں پڑتی۔ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ کلمہ گو کے لئے کوئی اور جسمانی زندگی نہیں ہے۔ یہ حق ہے مگر ہیں

کتنے ایسے کلمہ گو۔ خیر جھوٹ موٹ سی کلمہ گوئی ہی سہی۔ یہ جو ہم محمد الرسول اللہ کہتے ہیں اس لفظ کی محبوبیت کے صدقہ سے سب مسلمانوں کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ مگر موحدین کو چاہیے کہ وہ کسی مذہب کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہے ہوں۔ رُوح کے تمام ارتقائی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ فقیر کا مشن یہ ہے کہ یہ ساری منزلیں اسی زندگی میں پوری کرا دے۔ گویا حقیقی معنوں میں انسان کو مومن بنا دے۔ بابا قادر اولیا کے ایک خادم کا بیان ہے کہ جب اسے شرف خدمت بخشا گیا تو بشارت میں اسے دِکھایا گیا کہ وہ ایک مرغا ہے۔ مگر اسی قیام کے دوران چالیس دن کے اندر اندر اس کی باطنی ہیئت بدلتی گئی۔ وہ پھر بکرا بنا۔ پھر سانبھر۔ پھر سفید عقاب۔ پھر خدا جانے کیا کیا تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ وہ کام جن کے لئے نظامِ کائنات کے ارتقا میں کروڑوں سال لگے ہیں، فقیر کی نظرِ کرم سے چند دنوں میں پورے ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔ مگر جب کوئی کامل ہو جاتا ہے تو اس کو دفن کرتے ہیں اور جلاتے نہیں۔ واللہ شکر کرو کہ یہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے کہ تم نے مسلمان کے روپ میں جنم لیا۔ اگر تم چاہو تو اسی ایک چھوٹی سی زندگی میں تمہاری ذات میں وہ مقصدِ کائنات تکمیل پذیر ہو

سکتا ہے۔ ایک قدم بڑھو تو میں تمہاری طرف دس قدم بڑھتا ہوں اور اگر تم میری طرف چلتے ہوئے آؤ تو میں دوڑتے ہوئے تم تک پہنچتا ہوں۔ یہ حقیقتیں ہم سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں مگر قدم نہیں اٹھاتے۔ انسان کتنا، اس کا یقین کتنا اور اس کا عشق کتنا' البتہ جب ادھر سے فیضان شروع ہو جاتا ہے تو دل چیخ چیخ کر گواہی دینے لگتا ہے۔ رحمت بے تاب ہے کہ میں برسوں۔ صرف ایک پردہ حائل ہے اور وہ "میں" کا پردہ ہے۔ فقیر کامل اپنی محبت' اپنی شفقت' اپنے احسان اور اپنی ستاری سے افراد کو اس "میں" کی رکاوٹ سے ایسی آسانی سے نکال دیتا ہے کہ جب وہ ہوش میں آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ بس "تو ہی تو" ہے۔ یہ عشق کا بھینا بھینا عرفان یہ معرفت کا میٹھا میٹھا یقین، یہ توحید کی وسعت کا نرم نرم اجالا یہ ہے فقیر کا احسان۔ فقیر کا کام۔ فقیر کا مشن۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ جب یقین کامل ہو جاتا ہے تو بندہ صحیح معنوں میں بندہ ہو جاتا ہے اور بندگی کے رشتہ سے بندھ جاتا ہے۔ یہ رشتہ نماز ہے۔ نماز کیا ہے ؟ کہتے ہیں قرۃ العین ہے۔ مگر کیا بات ہے کہ پچھلے تین سو سال سے چاہے حجرہ میں ہوں چاہے مسجد میں' انتہائی خشوع و خضوع سے ہم کھڑے ہوتے ہیں مگر ہماری

آنکھوں میں اتنی بھی ٹھنڈک نہیں آتی جتنی کہ ایک بچھڑے ہوئے فرزند کو دیکھنے سے آتی ہے۔ کہتے ہیں نماز معراج المومنین ہے۔ اللہ اللہ ایک مومن کو دن بھر میں کم از کم پانچ دفعہ یہ معراج میسّر آنی چاہیئے مگر گذشتہ سینکڑوں سال میں کتنے ایسے مومن گزرے ہیں جن کو یہ معراج نصیب ہوئی ہے۔ نماز کیا چیز ہے۔ خدا کا حکم، ہر مسلمان پر فرض ہے اور فرض کو ہم جیسے بھی بنے ادا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فرض سے سبکدوش ہو گئے!!

بابا قادر کے دربار میں ایک مجذوب رہتے تھے۔ ایک دن مجذوب کسی دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر جو اپنے فرائض ادا کرتے رہتے تھے کہنے لگے۔ ارے تو نماز پڑھتا ہے ارے مرغے کو دیکھ جب اللہ اکبر کہتے ہیں تو چھری گلے پر پھر جاتی ہے۔ اور مرغا جاں بحق ہو جاتا ہے۔ تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا تو اللہ اکبر سنتا ہی کیوں ہے۔ اسی طرح ایک خادم کو حکم تھا کہ وہ رات کو سوئے نہیں اور ذکر کرے اس بیچارے پر جب نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو چائے منگوا کر پیتا تھا اور نیند کو بھگاتا تھا۔ یہی مجذوب ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ارے ارے۔ جب تیری شادی ہوئی تھی اور شادی کی دھوم دھام میں کافی رات گزر گئی تھی اور تجھے خلوت میں جانے میں دیر ہو رہی تھی

تو کیا اس وقت بھی نیند کو بھگانے کے لیئے چائے پینے کی ضرورت پڑی تھی؟ اسی طرح ایک اور خادم تھے جو تسبیح ہاتھ میں لے کر ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کا نام فرض کر لیجیے کہ کریم تھا۔ یہ مجذوب کہنے لگے کہ مان لے کہ میں ایک عورت ہوں اور میرا تجھ سے بیاہ ہو گیا تو کیا میں تسبیح ہاتھ میں لے کر کریم میرا دولھا، کریم میرا دولہا کا وِرد کروں؟ ارے بیوقوف مجھے دیکھ میرے انگ انگ سے سہاگ ٹپکتا ہے اور سہیلیاں دُور سے انگلی سے بتاتی ہیں کہ وہ دیکھو سہاگن جا رہی ہے۔

نماز، حضوری۔ یہ چیزیں ظاہر داری کے خول سے حاصل نہیں ہوتیں۔ فقیر کی نماز حقیقت کی نماز ہوتی ہے، قرۃ العین ہوتی ہے۔ آہ! ایک قلندر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان اپنی جنّت و دوزخ کے وسوسوں میں رہیں تو رہیں مومن کی انتہائے تمنّا دیدارِ الٰہی ہوتی ہے۔ اور یہی جنّت کا آخری مقام بنایا جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی صحیح معنوں میں کسی مجازی معشوق سے بھی عشق کیا ہے؟ کبھی اپنے معشوق کے مقابل بیٹھے ہو؟ وہ دل کی دھڑکنیں، وہ حیا اور حوصلہ کے مقدمے، وہ ایک نظر، وہ ایک دیدار، وقت ساکت، دلِ مجلّٰی، آنکھیں منوّر، نہ کلام نہ پیام، نہ سجود نہ قیام۔ ایک حضوری

کا عالم ہوتا ہے ۔ یہ ہے پہلی منزلِ عشق کی معراج' یہ ہے نفس وحواس کی معراج ۔ یہ ہے ان مٹی کی آنکھوں کی معراج ۔

مگر حقیقت کے اعتبار سے حُسن حسُن ہے' کیا مجازی کیا حقیقی ۔ مجازی کے پس پردہ وہی کارگر ہے ۔ سوچو' مومن کے دل میں کیا ہے ۔ اس کی معراج کیا ہوتی ہے ۔ بندہ کو جب اپنا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا قیام روح میں ہو جاتا ہے تو وہ اللہ اکبر کہہ کر جب قیام میں ہوتا ہے تو حیرت اس بات کی ہوتی ہے کہ بحضور کبریائی اس کے ہوش کیسے قائم رہتے ہیں ۔ سبحان ربی العظیم عظمت کی تعظیم کرتا ہے اور عجز ونیاز سے قدمبوسی کرتا ہے ۔ سبحان ربی الاعلیٰ ۔ انا اعطینٰک الکوثر ۔ آہ وہ معراج کے راز ونیاز ۔ اف کیا مجبوری ہے ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ ۔ موجودہ مسلمان تو نماز کو مجبوری سمجھتے ہیں ۔ فقیر نماز کے اختتام پر مجبوراً سلام پھیرتا ہے ۔ بندہ کے پاس اپنا کچھ نہیں رہ جاتا ۔ معبود کی رضا اپنا دین ہوتا ہے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں پانچ وقت قدمبوسی نصیب ہوتی ہے یا افضل ہے وہ فقیر جو نماز کا بھید افشا کر دے ۔

تو سامنے ہو میں سجدہ کروں

باباجان قبلہ اپنے خدّام کو باطن سے ظاہر کی طرف لاتے ہوئے

اور جب وہ معبود کی حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں تو انہیں نماز بھی پڑھنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ شریعت میں تو یہ حکم ہے کہ نماز قضا ہو جائے تو دُرّے مارے جائیں مگر حقیقت کی یہ رسم ہے کہ ایک گھڑی کے لئے بھی، سوتے یا جاگتے، اچھائی یا برائی میں۔ غرض ہر حال میں اگر ایک گھڑی کے لئے بھی ذکرِ خفی بند ہو جائے تو اس کی گردن اُڑا دی جائے۔ یہ اس کی روح کی موت ہے۔

اہلِ طریقت ذکر و اذکار کے لئے ایک دانا نباض حکیم کی طرح مزاج کی موافقت کے لحاظ سے اسمائے الٰہی میں سے کوئی اسم یا آیاتِ قرآنی میں سے کچھ عطا کرتے ہیں۔ اس عطا اور اجازت میں بھی بڑے رمز ہوتے ہیں جیسے ایک مشفق باپ اپنے فرزند کو تجارت میں لگانا چاہے تو اپنی کمائی کا کافی حصّہ دے کر اسے تجارت شروع کرواتا ہے۔ اسی طرح اجازت کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں کہ پیرِ طریقت اپنی کمائی کا کافی حصّہ مرید کو بخش دیتا ہے کہ اس سے ریاض کرے اور دولت کو بڑھائے عطا کچھ اور چیز ہے۔ یہ پیرِ حقیقت گویا اپنے آپ کو عطا کرتا ہے کیا احسان ہے۔ اکثر فقرا اسمِ ذات کے ذکر کی اہمیت کو واضح

کرتے ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ میں یہ لفظ اللہ ہے۔ اس کی تجلیاں اور اس کی برکات۔ اللہ اکبر جل جلالہٗ جلّ شانہٗ' اہلِ حقیقت کے یہاں اسم ذات وہی ہیں جو حقیقتاً دل میں ہوں۔ یہ ذکر خفی ہے۔ یہ عطا ہی ہوتا ہے۔ کسب سے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور جو عطا ہو جائے تو کبھی نہیں چھوٹتا۔ مرشد کے حکم کے سوا کوئی اور طاقت چھڑا بھی نہیں سکتی۔ یہ انسان کو ذات کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ بقول کسے۔

ایسی رنگ دو رنگ ناہیں چھوٹے
دھوبیا دھوئے چاہے ساری عمریا

اب صفاتِ الٰہی کے حاصل کرنے کی کوشش کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ خود بخود پھول کی خوشبو کی طرح پھوٹ کر نکلنے لگتی ہیں۔

غزل

میرے من میں رہتا ہے ساجن کا ڈیرا
یہاں ہر گھڑی ہے سویرا سویرا
جو پریتم کی اِچھّا سو پریمی کی اِچھّا
یہ چنتا کی دنیا اندھیرا اندھیرا
تری بھینٹ کرنے کو کیا اور لاؤں
یہ جیون کا چولا بھی ہے دان تیرا
ہری اوم پیتم۔ ہری اوم پیتم
تری آرتی ہے ہر اک سانس میرا
کنول بن کے بھگوان کی شوبھا دکھاؤ
ہے مُکتی کے ساگر میں تیرا بسیرا

(رحمان بابا)

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے
تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

گڑیا میں بھگوان گنوا یو ڈھونڈے دیس پرائے
نگر نگر کی ماٹی پھانکے جب بھی ہاتھ نہ آئے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے
تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

بھیس بدل کر پھرے اکیلا کوئی گرو کوئی چیلا
سکھشا کالے پیسہ دھیلا تن کی موج منائے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے
تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

دھرتی اور آکاش سنوارے ناپے تو نے چاند اور تارے
دیکھے بھالے ساگر سارے اپنا انت نہ پائے

کس پر تو اترائے بندے جیون بیتا جائے
تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

ودیا شکتی کو اپنایا مایا کا ایک کھیل رچایا
جو کچھ پایا سو ہی گنوایا کیسے گھر کو جائے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے
تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے
پریم کرے اور جگ کو نہلائے بھلا کرے اور برا کھائے
جگ میں پیت کی ریت نرالی پھول تو دے اور پتھر پائے
کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے
تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

(رحمان بابا)

دوہے

موہے تن سے کام نہیں میں من کا ہوں متوالا
من میں پیتم جھولا جھولے پی کر پریم پیالا

نین برسوں ساون بھادوں تو من جھولا جھول
پنیم پیتم گائے جا سب دکھ دلدر بھول

(رحمان بابا)

نشرِ فیض

باب ۲۰

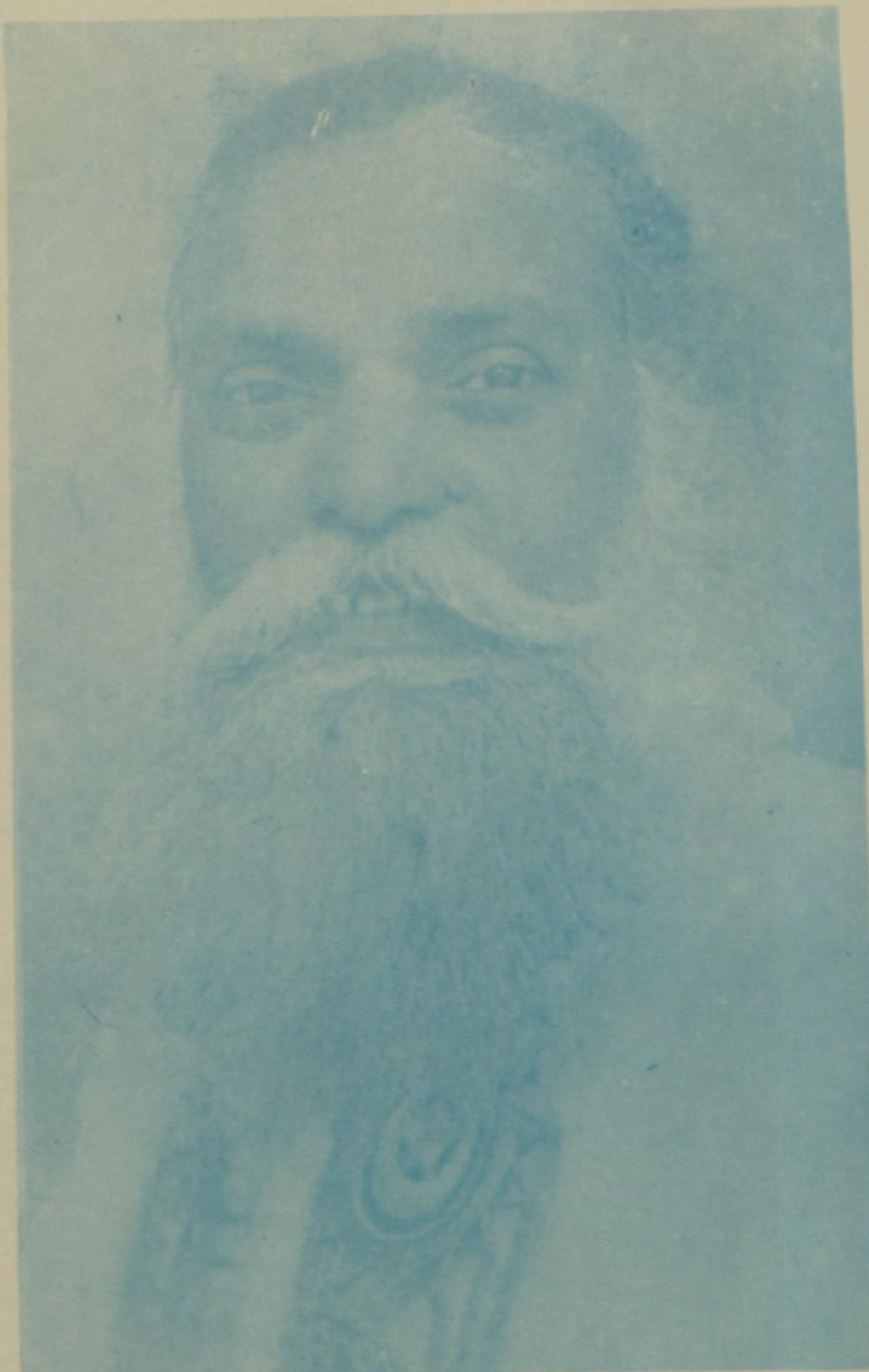
بابا قادر اولیا سے ان کے خاص الخاص کو جب اجازت ملتی ہے اور دنیا میں وہ دوسرے چشمے جاری کرنے کے لئے باہر جاتے ہیں تو صرف تین باتوں کا ہدایت ہوتی ہے۔

اوّل :- یہ کہ کسی کا دل نہ دُکھاؤ۔ یہ سادہ فقرہ ہے مگر سماج کی ساری شریعت ان سادہ الفاظ پر ختم ہے۔ یہ فقرہ سارے سماجی نظام کی کلید اور اخلاق حسنہ کا منبع ہے مقام محمود تک پہنچا سکتا ہے۔

دوئم :- یہ کہ اللہ اللہ کرتے رہو یعنی اپنے ذکر خفی کی احتیاط کرو اور اس میں شدّت پیدا کرو۔

سوئم :- یہ کہ خدمت کرو۔ خدمت حیا کا لازمی نتیجہ ہے۔ دوسرے کا درد اور دکھ خلوص و محبّت سے اپناؤ اور دل سے ان کی دینی و دنیوی مشکلات میں ہاتھ بٹاؤ۔

تمہاری یاد سے نصیب کامیاب ہو گیا
تو ذرّہِ یقیں چمک کے آفتاب ہو گیا



لنشرِ فیض

ڈھکی ڈھکی گھٹی گھٹی فضا میں وہ چمک اُٹھے
تو رازِ کائنات سارا بے حجاب ہو گیا

وہ ڈھونڈتے رہے خدا کو کعبہ و کنشت میں
ہمارے دل میں خود بخود وہ بے نقاب ہو گیا

نہ پوچھ اس مقام کو یہاں خرد بھی مات ہے
گناہ بھی اگر کیا تو وہ ثواب ہو گیا

صفات اور ذات کے قریب سے نکل گئے
ترا وجود ہی صفات کا جواب ہو گیا

بھلی لگی ہیں اس قدر تری ستم شعاریاں
کرم اگر کیا بھی تو نے وہ عتاب ہو گیا

بلند اور پست کا خیال بھی کہیں نہیں
یہاں تو اب خیال کا زہرہ آب ہو گیا

کچھ آنسوؤں کے گیت گا رہی تھی میری زندگی
نگہ کی چوٹ کیا لگی کہ دل رباب ہو گیا

ترس رہے تھے بادہ خوار ایک ایک گھونٹ کو
ترا خیال چھا گیا تو خود شراب ہو گیا

ترے نگر سے آ رہی ہے بوئے خوشگوار آج
کہ کل جو خار تھا وہ آج خود گلاب ہو گیا

(رحمان بابا)

دُعا

باب ۲۱

دعا ہے کہ اے قادرِ مطلق تو اس اُمّت کے گناہوں کو بخش دے۔ تیرے محبوب کی یہ کشتی منجدھار میں پڑی ہے اسے تو رُخ عطا کر اور ساحل تک پہنچا دے۔ ہم عاجز ہیں، مسکین ہیں۔ فخر الفقرا کی سیاہ کملی کی لاج رکھ۔ ہمارے دل سرد ہو چکے ہیں۔ انہیں ایک دفعہ پھر ایمان کی حرارت سے گرما دے۔ اے آقا! اے میرے مولیٰ! ہمارے عیب اور ہمارے گناہ کہ ہم تجھ سے بھی منکر ہیں۔ صرف تو ہی بخش سکتا ہے۔ اے غفور الرحیم تین سو سال سے جس ابتلا میں ہم گھرے ہیں اپنے فضل و کرم سے اسے ختم کر دے ایک دفعہ پھر اذانوں میں وہ روحِ بلالی پھونک دے۔ نمازوں میں وہ جذبِ مولیٰ علی عطا کر اور ہمارے اعمال کو اپنا رُخ دیدے۔ اے مولیٰ جو تو راضی ہو جائے تو جگ راضی ہے۔ ساری فطرت محکوم ہو جاتی ہے۔ اے ذوالجلال مسلمانوں کو جو ذلیل ترین حد تک پہنچ چکے ہیں وہ وقار عطا فرما جو تیرے نام لیوا کے شایانِ شان ہو۔

صلی اللہ علیک یا محمدؐ۔ اے سرورِ کائنات قوم کا درد تیرا عشق تھا۔ ہم تیرے ہی نام لیوا ہیں اور تیرا ہی نام لیتے رہیں گے۔ اپنی بدکاریوں اور نامرادیوں کی وجہ سے شرم آتی ہے تو شافعِ محشر ہے۔ محشر کا دن اور کون سا ہوگا۔ تُو زندہ اور پائندہ ہے۔ صرف تیرے فیضان سے تیرا عشق ہمارے دلوں میں جاگ سکتا ہے۔ ارحمنا! ارحمنا! ارحمنا! تو زندہ ہے پائندہ ہے آ۔ تیری اُمت سو رہی ہے۔ اس کو جگا دے اور زندگی عطا کر۔

اے پیرِ کامل! میری نگاہ تجھ تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ میں کیا مانگوں۔ کیا دُعا کروں۔ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس سوئی ہوئی قوم کی قسمت کو جگانا تیرا کام ہے۔ میری قسمت تیرا قلم ہے اور تیرا قلم عرش پر ہے۔ کچھ لکھ چکا کچھ لکھ رہا ہے۔ مرضیٔ مولیٰ ایک عاشق کے دل کی چاہ کے سوا اور کیا ہے۔ صبر، صبر، صبر۔ ہاں یہ سب سچ ہے مگر ذلّت میں بھی تو کیوں صبر کی تلقین کرتا ہے۔ اے میرے مکرم اس ذلّت کے غار سے نکال اور اس اُمّتِ محمدی کے ہر فرد کو روشنی کی شکل عطا کر کے دنیا پر ایک احسان بنا دے اور یا ھو، انسانیت کو مادہ پرستی سے ہٹا کر حق پرستی پر لگا دے۔

دعا ہے کہ جس شخص نے بھی دل سے اس کتاب کو پڑھا یا سُنا ہو بطفیل پنجتن پاک و بزرگان سلسلہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ انشاءاللہ اگر وہ بیمار ہے تو اسے شفا عطا ہوگی۔ مقروض ہے تو قرض سے سبکدوشی ہوگی۔ مظلوم ہے تو حاکم کے دل میں محبّت اور عزّت پیدا ہوگی۔ رزق میں کشادگی ہوگی۔ خود اس کو اور اولاد در اولاد سب کو اخلاق صالح عطا ہوں گے اور اعزاء و احباب سب پر فضل اور رحمت نازل ہوگی۔ اور جو اس کتاب کو بار بار پڑھے گا اس کی زبان میں شفا اور اثر پیدا ہوگا۔ اس کے دل کی کلی کھلے گی اور رہبر ضرور نصیب ہوگا۔ آمین یارب العالمین۔

نذرانۂ عقیدت

بحضورِ باباقادر اولیا رحمتہ اللہ علیہ

قال میں کیسے سما جائے ہے حالِ باوا جان
حال کی تخلیق جو کرتا ہے قالِ باوا جان

قادرؒ جیلاں نے دھارا قادرؒ ہندی کا رُوپ
اُس جلالِ حق سے مشتق ہے جمالِ باوا جان

جگمگا اُٹھے ہیں تاجِ اولیاؒ سے جو چراغ
اُن میں ناممکن ہے مِل جائے مثالِ باوا جان

اُن کے دَم سے ہے مسیحائی عبید اللہ کی
بارک اللہ مرحبا عِزّو کمالِ باوا جان

تشنگانِ علم و اسرار و رمُوز آئے ادھر
جامِ جمشیدی سے بڑھ کر ہے سوالِ باوا جان

اِک جھلک پر جن کی مر مٹنے کو چاہے دل میرا
ہے جمیل و دلکشا ایسا جلالِ باوا جان

وہ جو حمزہ ناخنِ عقدہ کشائے راز ہیں
بدر بننا ہے تو بن جاؤ ہلالِ باوا جان

اِک بار تو موج میں آ ساقی، دیدار کا جام پلا ساقی
مستوں کا کیف بڑھا ساقی، ہستوں کو کیف بنا ساقی

موسیٰ کے ظرف کی بات نہ کر ہم رندوں کے ہیں طور جدا
جب پیمانوں سے پیتے تھے اب خم کے خم لنڈھا ساقی

ہو نور تجلّی کی بارش، ہر دل پر برق گرائے جا
وہ قاب قوسین کے جلوے ان زلفوں کو پھیلا ساقی

دے اذنِ عام زمانہ کو، ان نینوں کو چھلکا تو سہی
تو بن ٹھن کر محفل میں تو آ رندوں کو بھڑکا ساقی

اس میری تیری دنیا میں تو سب کا آقا مولا ہے
ان مسجد مندر والوں کو سیدھی راہ لگا ساقی

جس جوت کی ہم سب کرنیں ہیں وہ جوت جگت میں پھیلا دے
سب تیری جھلک کے طالب ہیں تو سب کو مکھ دکھلا ساقی

اس زیست کے چٹیل صحرا میں تو رحمت کا بادل بن جا
یہ شبنم رو رو کہتی ہے اس بن میں پھول کھلا ساقی

نعمت کی تپش تو دیکھی ہے رحمت کی خلش بھی دکھلا دے
اوڑھی ہے شفاعت کی کملی اب کر دے حشر بپا ساقی

منصور اور دار کا افسانہ، دنیا بھر کو سنانا ہے
طاؤس و رباب کا چھوڑ بھی دے اٹھ اور تلوار اٹھا ساقی
جو خون بہایا سرمد نے، وہ خون اب رنگ دکھائیگا
آ خونِ جگر سے سینچ اسے، ہم سب کا خون بہا ساقی
ہم آگ سے کھیلنے والوں کو، ماحول میں آگ لگانی ہے
ناقوسِ ذکر و فکر بجا۔ میدانِ عمل میں آ ساقی

(رحمان بابا)

ھُو

درونِ کعبہ می رقصم و کعبہ گردِ من رقصد
سلامے می کنم بر یار و او در جانِ من رقصد

صفاتِ پاک من شد جامۂ ناموسِ عالم
مزیّن چار سو می کرد عریاں روح من رقصد

جہانے می کنم کشتہ، منم شمشیرِ عریانے
کہ خود تیغِ ادائے من درونِ چشم او رقصد

تماشہ خود کنم خود را نشانے او نمی یابم
بہ ایں اندازِ یکتائی بہ جانان جانِ من رقصد

حیائے شانِ بے چونی حجابے یافت در عشقم
تلاشش میکند خلقے و او در جانِ من رقصد

غیاثِ مستغیثانِ من، کشادِ جانِ ہستی ام
کہ خود آں مستغیثے در کشا بر جانِ من رقصد

گہے بینم ولی در شوخیٔ حُسنِ بُتاں رقصد
گہے یابم خبر در گرمیٔ عشقِ جہاں رقصد

(ولی الدین)

غزل

توئی اسرارِ جانم یا حبیبی | توئی روح و روانم یا حبیبی
لقائے تو جوابِ ہر سوالے | نہانی در عیانم یا حبیبی
نہ بودم من نہ ہستم من نہ باشم | توئی نام و نشانم یا حبیبی
وجودِ عشق را دادی نمودے | توئی تاب و توانم یا حبیبی
توئی مطلوب و مقصودِ دو عالم | توئی وردِ زبانم یا حبیبی
نگاہے یا حبیب اللہ نگاہے | یکے از کشتگانم یا حبیبی
شرابِ زیست را کیفے دگر دہ | زفرقت سر گرانم یا حبیبی

(رحمٰن بابا)

غزل

([illegible])

ترا ذوقِ نظر ہے میں نہیں ہوں | محبت کا اثر ہے میں نہیں ہوں
حقیقت بن گیا ان کا تصوّر | جمالِ سیم بر ہے میں نہیں ہوں
وہ شعر و نغمہ بن کر چھا رہے ہیں | تصوّر عرش پر ہے میں نہیں ہوں
سرور و جذب و مستی کا ہے عالم | اُدھر جو ہے اِدھر ہے میں نہیں ہوں
نشانِ بے نشاں ہے لا الٰہ میں | خبر بھی بے خبر ہے میں نہیں ہوں
محمدؐ، یا محمدؐ، یا محمدؐ | تو ہی تو سر بسر ہے میں نہیں ہوں

اے کہ وجہ حسنِ عالم زلفِ عنبر بوئے تو
لم یزل خود گشت قربان برخم ابروئے تو

روئے انور والضحیٰ را خود نشانے می دہد
رشتۂ واللیل دار د حلقۂ گیسوئے تو

یا مزمل یا مدثر آیۂ فتحِ مبیں
سجدہ گاہِ عاشقاں ہر لحظہ باید کوئے تو

تو دلِ رعنائے باطن سورۂ یٰسین صفت
یک جہانے دید طٰہٰ جلوہ گر در روئے تو

جانِ ما را الغیاث آمد مسیحِ دلبراں
یک نگاہِ ناز کشتہ ایں گدائے کوئے تو

رحمت اللعالمیں، یا حبیبی یا نبی
الصلوٰۃ والسلام از روح پاک سوئے تو

مدح تو خود کرد مولیٰ صاحبِ خُلقِ عظیم
در دلِ مسکیں ولی صلِّ علیٰ خوشبوئے تو

(ولی الدین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ

شجرہ شریف

چشتیہ صابریہ تاجیہ

از قلم

رحمٰن بابا

بسم اللہ السّلام

السّلام اے جلوہِ طور السّلام
صاحبِ نورٌ علیٰ نور السّلام

سرورِ کونین احمدؐ السّلام
رحمتِ عالم محمد السّلام

یا علی شمسِ تجلّی السّلام
واقفِ اسرارِ ربّی السّلام

یا حسنؓ نورِ ولایت السّلام
سرورِ اصحاب جنت السّلام

اے حسن بصری نجات السّلام
از تو خاصان را ہدایت السّلام

اے جناب عبدِ واحد السّلام
اے شہود حسنِ شاہد السّلام

حضرتِ ایازِ دانا السّلام
قطرہ با پہنائے دریا السّلام

حضرت ابراہیم ادھمؒ السّلام
از تو کارِ عشق محکم السّلام

یا سدید الدین خواجہ السّلام
بُرّشِ شمشیرِ مولا السّلام

یا ہُبَیرہؒ جانِ پاکان السّلام
تاجدارِ سینہ چاکاں السّلام

حضرتِ ممشادِ دنیوریؒ السّلام
اے جمالِ لمعۂ طورِ السّلام

شہ ابو الاسحاق حضرت السّلام
حاملِ انوارِ وحدت السّلام

یا ابو ابدال احمدؒ السّلام
جلوۂ نورِ محمدؐ السّلام

بو محمد خواجہ چشتی السّلام
صاحبِ صد جوشِ مستی السّلام

ناصر الدینؒ فاتح باب السّلام
اے قلندر سیفِ توّاب السّلام

اے شریفِ پاک طینت السلام
جامعِ شرع و طریقت السّلام

خواجۂ عثمانِ ہارون السّلام
آب و تابِ درِ مکنوں السّلام
یا معین الدین چشتیؒ السّلام
مظہرِ انوارِ قدسی السّلام
خواجہ قطب الدین کاکیؒ السّلام
قبلۂ قدسی و خاکی السّلام
اے فرید الدین شکر گنجؒ السّلام
شیخ اسلام و سخن سنج السّلام
یا علاؤالدین صابر السّلام
حاملِ اسرارِ قادر السّلام
خواجہ شمس الدین رہبر السّلام
معنیٔ اللہ اکبر السّلام
خواجہ داودِ مکیؒ السّلام
رمزِ وحدت نورِ حقی السّلام
بابا تاج الدینؒ نوری السّلام
پیکرِ صد جذب و مستی السّلام

بابا قادر اولیارا السلام
مظہرِ نورِ خدارا السلام

مہرِ تابانِ ہدایت السلام
شوکتِ عرشِ ولایت السلام

اے فروغِ جان وایماں السلام
دیدۂ بینائے قرآن السلام

شاہبازِ عرشِ اعلیٰ السلام
کارسازِ دین و دنیا السلام

ہر زمان بر خوان و بر سال السلام
از مریدان و زرحمان السلام

(رحمٰن بابا)

(سلام مقبول شدہ)

سلام بحضور باباقادر اولیاءؒ

حبیبی، شفیقی سلامٌ علیک
انیسی معینی سلامٌ علیک

رحیمی، کریمی سلامٌ علیک
شہنشاہِ قادر سلامٌ علیک

بشیری، نذیری سلامٌ علیک
علیمی خبیری سلامٌ علیک

خلیلی، کلیمی سلامٌ علیک
شہنشاہ قادر سلامٌ علیک

بہارِ حسینی سلامٌ علیک
مہ تاج دینی، سلامٌ علیک

شہ عالمینی سلامٌ علیک
شہنشاہ قادر سلامٌ علیک

شہ حسن و خوبی سلامٌ علیک
سراپا عجیبی سلامٌ علیک

شبیہہِ حبیبی، سلامٌ علیک
شہنشاہ قادر، سلامٌ علیک

بہائے ولایت، سلامٌ علیک
ندائے امامت سلامٌ علیک

لقائے رسالت، سلامٌ علیک
شہنشاہ قادر سلامٌ علیک

فقیرِ قلندر، سلامٌ علیک
سپہدارِ حیدر، سلامٌ علیک

دلی کے مقدر سلام علیک
شہنشاہِ قادر سلامٌ علیک

(ولی الدین)

سلام بحضور بابا قادر اولیاءؒ

نورِ تاجِ الورائ سلامٌ علیک قادرِ حق نمائ سلامٌ علیک

معنیٔ والضحیٰ سلامٌ علیک نکتۂ اینما، سلامٌ علیک

السّلام اے شاہِ شاہانِ فخرِ انساں السّلام

السّلام اے ماہِ خوباں مہرِ تاباں السّلام

نورِ چشمِ تاجِ دین و شمس تبریز السّلام

مو بہ مو، سر تا بہ پا اے شاہِ جیلاں السّلام

روحِ آدم جانِ ابراہیم و موسیٰ و مسیح

جانشین و وارث فخرِ رسولاں السّلام

رحمتِ عالم کی کملی اوڑھ کر آئے ہو تم

چارہ سازِ بیکساں، جانِ غریباں السّلام

واسطہ ہے مصطفیٰؐ کا مصطفائی کیجیو

اے ادائے کن فکانی حکم یزداں السّلام

باز می گوید ولی اے شاہِ شاہاں السّلام

الصّلوٰۃ والسّلام اے فخرِ دوراں السّلام

(ولی الدین)

قادر ولی تم ہو

گلہائے عقیدتمند بحضور بابا قادر اولیاء قدس سرہٗ

جہاں میں رحمۃ للعالمیں قادر ولی تم ہو
وصی انبیاء و اولیاء قادر ولی تم ہو

ولایت کے نگیں۔ نور مبیں اور نور تاج الدین
زمانہ تم سے روشن ہے چراغِ احمدی تم ہو

علم انا فتحنا کا تمہارے ہاتھ سے قادر
علم بردارِ حق ہو اور نشانِ حیدری تم ہو

تمہارے رنگ حسینی میں حسینی شان ہے پیدا
شہیدانِ الٰہی کے لئے پورِ علی تم ہو

بحکم قم باذنی مردہ روحوں کو جگاتے ہو
مقام کن فکانی میں مسیح عیسوی تم ہو

نگاہیں ڈال کر قادر بدل دیتے ہو تقدیریں
قلندر، بو قلندر، حیدری و احمدی تم ہو

تم ہی ٹوٹے دلوں کو اپنے سینہ سے لگاتے ہو
ولی کا دو جہاں میں آسرا قادر ولی تم ہو

(ولی الدین)